SERIAL : 13

ISSN No. 2454-4035

قیمت۔ ۵۰ روپئے

جولائی۔ دسمبر ۲۰۲۰

انوارِ تحقیق

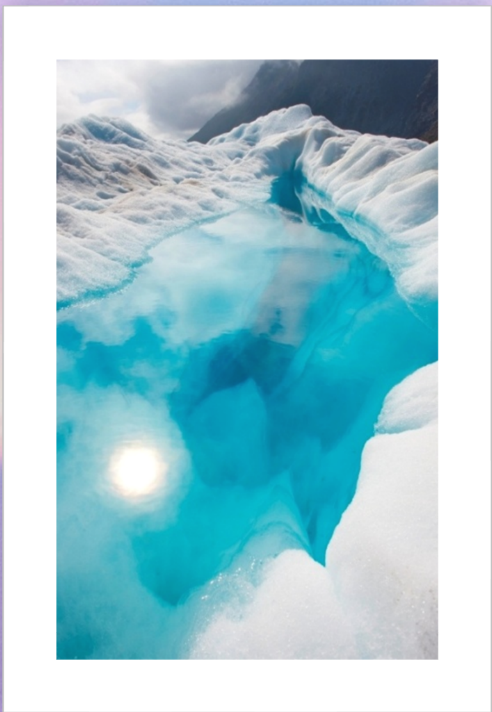

جلد۔ ۷

شمارہ۔ ۷۔۱۲

مدیران اعزازی

پروفیسر صاحبزادہ صولت علی خان * پروفیسر ای اے حیدری

مدیر

سید الیاس احمد مدنی

ISSN No. 2454-4035 Serial No. 13

PRICE – 50/- July-December 2020

ANWAR-E-TAHQEEQ

A Multilingual & Multi disciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan

Vol: 07

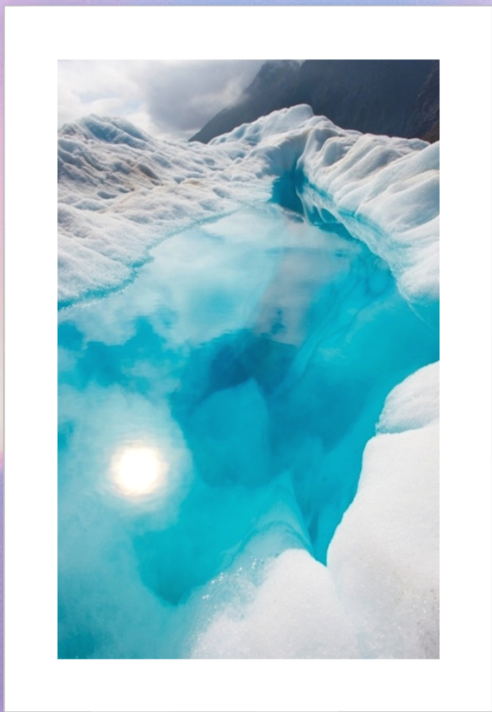

Issue: 7-12

HONORARY EDITORS

PROFESSOR SAHEBZADA SAULAT ALI KHAN

PROFESSOR E. A. HAIDARI

CHIEF EDITOR

SYED ILIYAS AHMAD MADNI

قلعہ گولکنڈہ،حیدرآباد،دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۷ شمارہ۔۷تا۱۲ جولائی۔دسمبر ۲۰۲۰ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۱۰۰روپۓ سالانہ:۔۱۰۰۰روپۓ

نگراں:۔**سید عادل احمد**،محکمہ آثارقدیمہ،اسٹیٹ میوزیم،حیدرآباد،تلنگانہ

مدیران اعزازی:

صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خان،ڈائرکٹر اے پی آر آئی،ٹونک(راجستھان)

ڈاکٹر ای اے حیدری،ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو،گورنمنٹ لوہیا پی جی کالج چورو(راجستھان)

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389،نیم باولی مسجد،کٹھورا ہاؤس،گولکنڈہ قلعہ،حیدرآباد،تلنگانہ۔008 500

موبایل نمبر:۔09966647580،09667489786 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید،علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔مانو,حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔بی ایچ یو،وارانسی

ڈاکٹر محمد احتشام الدین،علی گڑھ

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔ اے ایم یو،علی گڑھ

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر۔اے ایم یو۔علی گڑھ

ڈاکٹر احمد نوید یاسر،اے ایم یو۔علی گڑھ

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد،دکن

متھی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف،حیدرآباد،دکن

ریویو کمیٹی

پروفیسر مسعود انور علوی۔علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔لکھنؤ

پروفیسر عزیز بانو۔حیدرآباد

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک،تلنگانہ اسٹیٹ،حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز،حیدرآباد،دکن

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان۔مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم،حیدرآباد،دکن

جناب ایم اے غفار،استاد خطاطی،ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا،ماہر مسکوکات،ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
اداریہ		۳
حضرت نیاز بریلویؒ کے فارسی کلام کا شوروجدان	پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید	۴
شورشِ عشق نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے	پروفیسر زیبا محمود	۱۲
ابوالفیض عثمانی اور راجستھان میں اردو زبان وادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات ایک مطالعہ	پروفیسر ای اے حیدری	۲۰
تفہیم وترسیل: ایک تجزیاتی مطالعہ	محمد شاہد پٹھان	۲۴
ممتاز ذاکر حسین نقاد پروفیسر مولانا سید شبیہ الحسن نونہروی طاب ثراہ	پروفیسر انیس اشفاق	۴۱
غالب کا تصورِ زندگی	پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی	۴۵
اردو غزل کا سماجی کردار	ڈاکٹر تسلیم	۵۵
موازنۂ انیس ودبیر پر ناقدین کے نظریات	ٹیپو سلطان	۵۸
حالی کی تنقید نگاری	ڈاکٹر قمر نازنین	۶۳
علامہ اقبال اور قرآن کریم	ڈاکٹر سید عادل احمد	۶۶

اداریہ

قران کی معرفت

قران کی معرفت جس قدر کامل ہوگی اسی قدر خشیت اور غم کا دل پر غلبہ ہوگا۔حسن بصری نے فرمایا۔'اللہ کی قسم آج جو بندہ بھی قران کی تلاوت کرتے ہوئے،اس پر ایمان رکھتے ہوئے صبح کرتا ہے،اس کا غم زیادہ ہوتا ہے،اور اس کی خوشی و مسرت کم ہو جاتی ہے، رونا زیادہ ہوتا ہے اور ہنسنا کم ہو جاتا ہے۔اس کی محنت وجاں فشانی اور مشقت زیادہ ہوتی ہے اور اس کا آرام وچین اور بے کاری کم ہو جاتی ہے'

(احیاءالعلوم ج۔۱ ص۱۹۲)

قران کی تلاوت کا حق اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ تلاوت میں زبان کے ساتھ عقل و دل بھی شریک رہیں۔زبان کا حصہ حروف کو صحیح طریقے سے ادا کرنا،عقل کا حصہ معانی کو سمجھنا اور دل کا حصہ نصیحت پذیر ہونا اور اثر قبول کرنا۔گویا زبان صحیح طریقے سے کلمات ادا کرے،عقل ترجمہ کرے اور دل نصیحت وعبرت حاصل کرے

حضرت نیاز بریلویؒ کے فارسی کلام کا شور و وجدان

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید
صدر شعبۂ فارسی، ڈائیریکٹر انسٹیٹیوٹ آف پرشین ریسرچ
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ

حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی قدس سرہٗ بارہویں صدی ہجری یعنی اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایک عظیم المرتبت صوفی اور مرتاض سالک طریقت تھے۔حضرت نیاز بریلوی کی ولادت ۱۱۷۳ھ میں سرہند میں ہوئی۔عہد طفلی میں ہی شفقت پدری سے محروم ہوگئے۔والدہ نے پرورش و پرداخت کی اور تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔سرہند میں ابتدائی تعلیم کی تکمیل کا بعد حضرت نیاز دہلی میں شاہ فخر الدین دہلوی کی بارگاہ میں علوم ظاہری کی تکمیل کے لئے حاضر ہوئے اور محض سترہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ میں کمال حاصل کرلیا۔علوم ظاہری سے فراغت کے بعد حضرت نیاز بریلوی نے حضرت شاہ فخر الدین دہلوی کے دست حق پرست پر بیعت کرلی اور علوم باطنی کی تکمیل میں منہمک ہوگئے اور کچھ ہی مدت میں اتنا کمال حاصل کرلیا کہ ان کے شیخ نے انہیں اپنی خلافت سے سرفراز کردیا اور بریلی میں اقامت اختیار کرکے رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کرنے کا حکم دیا۔چنانچہ شاہ نیاز بریلوی نے شیخ کے حکم کے مطابق بریلی کو اپنا مستقر بنایا، ایک خانقاہ کی تاسیس کی اور مسند رشد و ہدایت و درس تدریس آراستہ کی۔حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی، حضرت فخر الدین دہلوی کے اتنے ذی استعداد خلیفہ ثابت ہوئے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یوپی میں سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے فروغ اور اعتبار و شہرت کا سرخیل تصور کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ نیاز بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو صانع ازل سے ایک شوریدہ و دردمند دل اور اسرار و رموز تصوف و عرفان سے آشفتہ و آمیختہ فکر و خیال کا جہان عالی ودیعت ہوا تھا۔حضرت نیاز کی ذات مشرباً جامع سلاسل تھی جہاں خواجگان چشت اور اقطاب و مشائخ قادریہ کی تعلیمات و فکر نے باہم مل کر ایک تلاطم انگیز آبشار عرفان پیدا کردیا تھا اور شوریدگی و آشفتگی کا یہ حسین امتزاج حضرت نیاز کی تحریروں میں اس قدر پیوست اور نمایاں ہے کہ عرفان و سلوک کا ذرا سا بھی چسکا رکھنے والا اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔خصوصاً حضرت نیاز کے اشعار اور کل فارسی کلام ان کے باطنی تموّجات کا بہترین مخزن ہیں۔حضرت نیاز کے کلام میں معرفت و سلوک کے اسرار و

رموز کی نہایت عارفانہ تشریح وتصریح اور تحلیل وتحدیث نظر آتی ہے۔

حضرت نیاز بے نیاز کے کلام میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ بڑی آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔وحدۃ الوجود ایک ایسا نظریہ عرفان وتصوف ہے جسے کا علمائے متصوفہ کا ایک بڑا طبقہ نہ صرف یہ کہ معتقد ہے بلکہ یہ نظریہ راہ سلوک وطریقت ،صوفیائے کرام کے ذہن وفکر میں اس طرح سرایت ہے کہ انہیں ہر شئے میں وجود باری تعالی کی جلوہ افروزیاں نظر آتی ہیں ۔ چنانچہ حضرت نیاز بے نیاز بھی وحدۃ الوجود کی شراب طہور سے اس قدر سرمست ہیں کہ ان کے کلام کا ہر ہر لفظ اسی مضمون کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔حضرت نیاز کا دل عاشق اسی وحدۃ الوجود کے فیض سے ذات مطلق کی جلوہ گاہ بنا نظر آتا ہے اوران کے دل کی کرسی امکان،سلطان وجوب کے عرش کی مانند ہے۔اسی عاطفۂ نیاز نے حضرت نیاز کی نگاہ میں دنیا کو ایک بلبلے کی مانند نمودار کر رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت نیاز بے نیاز کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جلوہ گاہ ذات بین‘ درمنظر ایوان دل — عرش سلطان وجوب این کرسی امکان دل
گنبد گردون عالم از حبابی بیش نیست — کو نمودار آمدہ از بحربی پایان دل
دید چون میدان دل برهان سلم نقص یافت — منتج عکس قیاس ست حجت وبرهان دل
چون زلیخا کی شوم من مبتلای یوسفی — صد هزاران یوسف مصر یست در کنعان دل
از بیان این و آن خاموش بنشین ای نیاز — باش مستغرق بدیدار رخ جانان عشق

اس کلام میں مقام امکان میں ذات وجود کی چھپر کھٹ کا مرصع ہونا یعنی تخت ناثبات پر بادشاہ علی اطلاق کی جلوہ گری نے ترک وتجرید کا ایسا سبق پڑھایا کہ ساری دنیا کی رعنائیاں حضرت نیاز بے نیاز کی نگاہ میں خزف ریزوں کی مانند ہوگئیں ۔ظاہر ہے جب عاشق نیازمند کے سامنے محبوب کا حسن بے نیاز جلوہ گر ہے تو اسے ادھر ادھر کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں اسی لئے بیان این وآن پر دل کی سرزنش کرتے ہوئے اسے جلوۂ جانان کے دیدار میں مستغرق رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

وحدۃ الوجود کی حشر سامانیوں نے حضرت نیاز بے نیاز کو اس قدر سرمست کر رکھا ہے کہ انہیں ہر طرف ذات مطلق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ساری اشیا اور سارے نفوس آئینہ الہی کی تصویر ہیں ۔وہی ذات ہے جو خود اپنے حسن کو نہارنے کے لئے حجلۂ خلوت سے نکال کر عالم جلوت میں جلوہ افروز ہوئی۔کبھی ناقوس بدست شکل ترسا میں کلیسا کو رونق بخشی،کبھی تسبیح وعصا کے ساتھ جبہ ودستار میں مشائخ کی صورت زوایا وخانقاہ کی زینت بڑھائی۔وہی چہرے کا نور ہے اور وہی پیشانیوں کی چمک ہے۔حضرت نیاز ایسے سالک کو گمراہ تصور کرتے ہیں جو نیرنگی دنیا کو ماسوائے مولی جانتے ہیں۔فرماتے ہیں؛

ای دوست بہ بین همہ سوروی خدارا — با عین نگاهی

می دان به یقین این همگی ما وشما را   مرآة الهٰی
خود بهر تماشای رخش آمده بیرون   از حجلهٔ خلوت
گه دلق ببر کرده وگه صورت دارا   باحشمت وجاهی
گه سوی کلیسا شده ناقوس بدستش   درپردۂ ترسا
گه کرده بدست آمده تسبیح وعصارا   پوشیده کلاهی
گه معتکف مسجد و در کنج تفرد   پنهان زجهان شد
گه شاهد محفل شده آن ' انجمن آرا   رشك خور و ماهی
گمراه طریقی ! اگرش غیر بدانی   ای طالب مولیٰ
بینی همه او گر همه این ماوشما را   آئی سوی راهی
مانند نیاز آئی برون از چهه هستی   گر عاشق حقی
زان پس تو خدا باشی وبینی توخدارا   درهر پر کاهی

ایک دوسرا مستزاد جو حضرت مولانائے روم کے تتبع کی مکمل عکاسی کرتا ہے وہ بھی حضرت نیاز کے فکر وحدۃ الوجود کا نہ صرف یہ کہ آئینہ دار ہے بلکہ شور و وجد کا ایسا مرقع ہے جو اہل اللہ کی مجالس سماع کی حرقت والتہاب' سوز وگداز اور وجدان ماوراء کا باعث ہے ۔حضرت نیاز کو ذات مطلق ہی سر پر تاج ودیہیم آراستہ کئے شاہانہ شکوہ سے جلوہ فرما نظر آتی ہے جو دنیا کو مسخر کئے ہوئے ہے۔وہی ذات حق کبھی قلندرانہ شان میں دلق پوش دکان بہ دکان سرگرداں ہوتی ہے۔کبھی خود اصنام کا پیرایہ پہنتی ہے اور کبھی آذرانہ انداز میں بت گر ہوکر جلوہ گر ہوتی ہے۔کبھی خلیل اللہ کی شکل میں بت خانے میں پہنچ کر بت شکنی کرڈالتی ہے' کبھی شمع کی صورت مخزن انوار ہوتی ہے اور کبھی پروانے کی صورت خود اسی شمع پر نثار ہوتی ہے۔چنانچہ حضرت نیاز فرماتے ہیں:

خود تاج بسر صورت شاهانه برآمد   دارای جهان شد
خود دلق ببر شکل گدایانه برآمد   دکان به دکان شد
خود گشت بت وخود بتراشید بتان را   درصورت آرا
خود گشت خلیل وسوی بت خانه برآمد   بشکست و روان شد
خود بر صفت شمع پر انوار عیان ست   روشن کن مجلس
خود بود که اوصورت پروانه برآمد   قربان بجان شد

حقا کہ همو نست کہ او پرده نشین بود　　درحجلۂ غیبت
باصورت زیبا ز نهانخانہ برآمد　　درعین عیان شد
گاهی متجمل شده بر مسند خوبی　　درصورت لیلی
گہ قیس شده عاشق دیوانہ برآمد　　بی خانہ ومان شد
گہ صورت زلف آمده گہ هیبت کاکل　　دام دل عاشق
گہ چوب شده برصفت شانہ بر آمد　　در موی بتان شد
خود بود کہ او رفت زجیلان سوی بغداد　　شیخ همہ عالم
خود گشت نیاز و چو مریدانہ بر آمد　　از معتقدان شد

حضرت نیاز بے نیاز کا سارا کلام دردِ عشق اور اسرار معرفت کا مخزن ہے۔ ان کے اشعار کے ہر ہر لفظ سے سرّ معرفت کردگار کی گلفام کی تراوش ہوتی ہے۔ ان کی ذات فنائیت حق میں اس مقام پر پہنچی نظر آتی ہے جہاں خود ان کی ذات محدودیت لایعنی سے جدا ہو کر ذات مطلق کی وسعت وبیکراتی کا جزو ہوگئی ہے۔ پرتو ذات ان کے قلب پر پیہم اس طرح متجلی ہوتے ہیں کہ ان کا وجود خود شر ربار خرمن بن چکا ہے' ان کی ہستی کی بنیادیں نیستی سے مستحکم و پائیدار ہو چکی ہیں اور غلبات عشق نے انہیں قشقہ وزنار میں گرفتار کرلیا ہے جو زاہد کی نگاہ میں بظاہر کفر کی نشانیاں ہیں لیکن عاشق صادق کی نگاہ میں اس قشقہ پوشی اور زنار بدوشی کی توجیہات کچھ اور ہیں۔ فرماتے ہیں:

سر حق پنها نست اندر معنی اسرار من　　ظاهر ش پیدا ست اندر صورت اظهار من
از محیطم نقطۂ مرکز بود اقلیم ملك　　چشم دل بکشا و بنگر وسعت پرکار من
نور ذاتش بردلم هردم تجلی میکند　　تاب دیگر مید هد هر شعلۂ دیدار من
در بنای هستیم از نیستی مستحکمی ست　　در شکست و ریختن شد پستی دیوار من
زاهد از سر سوادالوجہ من آگہ نہ ای　　نیست درفهم تو رمز قشقہ و زنّار من

استیلائے عشق، عاشق زار کیلئے اپنے وجود اور اپنی ہستی سے بیگانگی کا سبب ہوا کرتا ہے۔ محبوب کی ادا و صفات میں عاشق بیدل کا استغراق اس سے گہگاہ ویسی ہی حرکات وسکنات کے صدور کا موجب ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ کچھ ایسی ہی کیفیت کا مشاہدہ حضرت نیاز کی اس غزل میں ہوتا ہے کہ؛

بیچون و بیچگونم عنقای قاف قدسم　　بی شبہ و بی نمونم عنقای قاف قدسم
بیرنگیست رنگم ' رنگی ست عار وننگم　　دانی کہ من چگویم عنقای قاف قدسم

از خلق ماسوایم و زامر ماورایم — برتر ز کاف ونونم عنقای قاف قدسم
هر چند درظهورم نور ظلام ونورم — درپردهٔ کنونم عنقای قاف قدسم
سلطان بی نیازم گوصورت نیازم — نشناسیم که چونم عنقای قاف قدسم

طریقت وسلوک میں سالک واقعی جب تک اپنی صفات حادث کوترک کر کے صفات قدیم کواختیار نہیں کر لیتا اس وقت راہ سلوک میں خام تصور کیا جاتا ہے اوراسی ترک صفات وذات فانی کا نام فنا ہے جوسلوک کا مقام ومرتبہ تمکین ہے۔ چنانچہ حضرت نیاز بھی اس مرتبہ تمکین یعنی مقام فنا پر نہ صرف فائز نظر آتے ہیں بلکہ ہر سالک کواس کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ پندار وگمان کے پردے جب تک حضرت نیاز نے چاک نہ کرڈالے اس وقت ان کی نگاہیں جمال مطلق کے دیدار معنوی سے محروم تھیں اور جب یہ حجاب وہمیہ دور ہوگئے تو انہیں اپنے گلشن میں بہار نو وزیدہ کا احساس ہونے لگا اور اب ان کا وجود جلوہ گاہ ذات اور آئینہ صفات ہوگیا جہاں عینیت اور جدائیت دونوں کی لذتیں میسر آنے لگیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

من پاکباز عشقم ذوق فنا چشیده — آهوی دشت هویم از ماسوا رمیده
بد پرده های وهمی مارا حجاب دیده — دیدیم روی جانان این پرده ها دریده
گل گشت غنچهٔ دل، دلبستگیش واشد — چون باد نو بهاری بر گلشنم وزیده
من نور ذات حقم، ای صاحب بصیرت — درصورتم اگرچه از خاك آفریده
روح الٰهیم من، جان خدائیم من — از صنعت عجیبه درآب وگل دمیده
من جلوه گاه ذاتم، هم مظهر صفاتم — هم اصل کائناتم از نورش آفریده
آئینه پرصفایم، جام خدانما یم — هم عین وهم جدایم ای مرد برگزیده
از جام عشق مستم، مستانهٔ الستم — بی پاوبی سرستم از قید تن رهیده
زاهد مگیر برمن، بگذر زگفتگویم — نشنیده ای که فرقست دردیده وشنیده
قول نیاز بشنو یعنی ز خود برون شو — چون از خود برآئی، باشی خدارسیده

حضرت نیاز عشق حقیقی میں سوختہ وکوفتہ ہیں اور یہ عاطفہ عشق ان کے وجود پر ایسا مستولی ہے کہ تفاوت مذہب ودین کے تعصب سے فیض عشق نے حضرت نیاز کو بے نیاز کر دیا ہے۔ حضرت نیاز ”هرگز نمیرد آنکه دلش زنده به عشق“ کے حافظ شیرازی کے اسرار معنوی سے نہ صرف یہ کہ آشنا ہیں بلکہ کشتۂ شمشیر عشق کو موت سے مامون اور مردۂ بے جان عشق کو زندۂ جاوید شمار کرتے ہیں۔ حقیقت کے بازار میں ماسوائے حق کوئی سرمایہ ومتاع انہیں نظر نہیں آتا اور دوکان عشق میں فنا سے زیادہ

ہستی کوئی جنس انہیں نظر نہیں آتی۔ آیئے عشق کی نیرنگیاں خود حضرت نیاز کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے، کہتے ہیں؛

پرتو مهر قدیم ست این مه تابان عشق — جلوۂ نور کلیم ست آتش سوزان عشق
دودآه سرکشی از سینۂ سوزان من — مد بسم الله باشد برسردیوان عشق
عاشقان در بینوائی خسرویهامی کنند — شاهی کونین داردبی سر وسامان عشق
در حریم وصل جانان در نهادم چون قدم — هستیم را کرد بیرون ازدرش دربان عشق
دارد آزادی زتقلیدات وهمی بی گمان — هر که دارد پای در زنجیر ' در زندان عشق
فارغ از رسم وره گبرو مسلمان ساخته — مرحبا صد مرحبا بر لطف و بر احسان عشق
کشته شمشیر عشق از مرگ باشد درامان — زندۂ جاوید باشد ' مردۂ بی جان عشق
لیس فی سوق الحقیقته من متاع غیر حق — لیس من دون الفنا ' جنس علی دکان عشق

عشق کے فیض نے حضرت نیاز کوایسا سرمست کرڈالا ہے کہ ایک طرف اگرانہوں نے ننگ وناموس کورخصت کردیا ہے تو دوسری طرف عقل وہوش سے فراق اختیار کرلیاہے، زہد وتقوی کوترک کردیا ہے، جبہ ودستار کو رہن کرڈالا ہے اور سبحہ وتسبیح کے عوض رشتۂ زنار سے اپنا تعلق استوار کرلیا ہے اور یہی مشورہ ان کا ان زاہدوں کو بھی ہے جو خرقۂ سالوس میں بے معنی اور بے فائدہ زہد وتقوی کا ڈھونگ کرتے ہیں، فرماتے ہیں؛

مست گشتیم از دوچشم ساقی پیمانه نوش
الفراق ای ننگ وناموس الوداع ای عقل وهوش
شد تنم همرنگ باجان ، جان به تن همرنگ شد
می بردهر جا که خواهد جان بتن خانه بدوش
گفتمش ای جان من! هم جان وهم تن خود تویی
گفت فی الواقع ولی درستر این اسرار کوش
زهد وتقویٰ در فگندم زیر پای آن صنم
مذهبم عشق ست ورندی مشربم جوش وخروش
زاهدا ! بشنو خدارا آنچه میگویم ترا
زهد بی معنی گذار وجام عشق از من بنوش

تصوف وعرفان کے اسرار ورموز کے علاوہ حضرت نیاز بے نیاز کے فارسی کلام میں مناجات ونعت کے ساتھ ساتھ منقبت حضرت مولائے کائنات علیہ السلام منقبت حضرت سیدنا شہید اعظم امام حسین علیہ السلام اور حضرت سیدنا غوث الثقلین غوث اعظم محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ، حضرت خواجۂ خواجگان سلطان الہند غریب نواز رضی اللہ عنہ اور محبوب الٰہی سلطان جی حضرت سیدنا نظام الدین اولیاء قدس سرہ وغیرہ کی منقبتیں بھی شامل ہیں۔ حضرت نیاز کا نعتیہ کلام بھی صوری ومعنوی دونوں اعتبار سے ارفع واعلیٰ ہے ۔نعت حضرت سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی حضرت نیاز کی شوریدگی اورالتہاب قلبی جالب توجہ ہے۔ سرکار نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی کالبد انسانی میں جلوہ گری کو حضرت نیاز اوج انسانی کا منتہائے کمال اورعزوتمکین قرار دیتے ہیں اور ساری کائنات کے لئے ان کے ظہور اور بعثت کو شرف وعزت کی معراج جانتے ہیں۔ سچ ہے کہ خاک کے بنے انسان کو خالق کائنات نے صرف اورصرف اسی ذات والاصفات کی وجہ سے شرف اور اشرفیت کے طغرائے منشور سے سرفراز فرمایا ہے جومحبوبیت کے حسین آسمان کا درخشندہ آفتاب ہے، جس کی بزم میں حسن یوسف صبح کا ٹمٹماتا چراغ ہے، جس کے چہرۂ انور کی تابانی سے شبستان دنیا منور ومعمور ہے، جس کے جمال وحسن سے آفتاب، نور کی دریوزہ گری کرتا ہے، جس کی ایک نگاہ آئینۂ دل کو واجب نما اور حق آشنا بنادیتی ہے اور جس کی جنبش ابرو دلوں سے امکان کے زنگ دور کر کے مصقل کر دیتی ہے۔نعت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؛

زھی عزوعلای منتھای اوج انسانی	نبی یثربی ومھبط تنزیل فرقانی
امیر عالم امری ، شه معمورۂ خلقی	ادیب علوی وسفلی، رسول انسی وجانی
ظھور کامل ذات وصفات حضرت یزدان	حبیبی ، سیدی ، محبوب خاص الخاص ربانی
درخشان آفتاب آسمان حسن محبوبی	چو شمع صبح در بزمش نمایده ماه کنعانی
شبستان جھان روشن زنور ماهِ روی او	زتاب شعلۂ حسنش کند خورشید رخشانی
کند دریك نگه واجب نما ، آئینه دل را	بیك چشمك زداید از رخش زنگار امکانی
نیاز اندر دلت گر برزخ کبراش جاگیرد	نه بینی تا ابد روی پریشانی و حیرانی

مختصراً یہ کہ حضرت نیاز بے نیاز قدس سرہٗ کا عارفانہ فارسی کلام صوفیائے حق اور سالکین راہ کی مجلسوں میں جلائے قلوب کے لئے اس چقماق کی طرح شمار ہوتا ہے جو دل میں شور ووجدان کی آگ کو شعلہ زن رکھنے کے لئے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

حضرت نیاز قدس سرہ کے فارسی کلام کا سرمایہ ایک ہزار چھیانوے اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ۹۲؍اشعار کی ایک مناجات، ایک سو دو غزلوں کے ۹۱۴؍اشعار، ۵۰؍اشعار پر مشتمل ایک مختصر مثنوی اور ۴۰؍اشعار پر محیط پانچ مستزاد

شامل ہیں ۔حضرت نیاز کا کلام **مــاقـل و دل** کا آئینہ ہے جس میں اگرایک طرف سالک کی روح میں اضطراب و بےچینی پیدا کرنے کے دوآتشہ محلول عرفانی کے لبریز مٹکے ہیں تو دوسری طرف عارف کی حرقت قلب وجگر کوسکون عطا کرنے والے مسکن اجزا بھی ۔حضرت نیازؒ کے اشعار آہنگ وصوتیات اور پرواز فکر وتخیل گویا صورت ومعنی دونوں اعتبار سے شورانگیزیوں کے آئینہ دار ہیں ۔یعنی اگر اندیشہ وافکار آتشیں ہیں تو بحریں بھی اس کی آتشنا کی کومزید کرتی نظر آتی ہیں۔مولانا رومؒ کے تجملات عرفانی کاعکس حضرت نیاز کی شاعری میں بھی جلوہ گر ہے۔غزلوں اورمستزاد میں جلال رومی کی کج ادائیاں مستظہر ہیں۔خود حضرت نیاز کےعرفانی تجارب بھی اشعار کی کسوت میں سالکین کی رہنمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اسی کے ساتھ حضرت نیاز کےاس شعر پرمیں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ:

عشـــق آنســـت کـــزو نـــام و نشــــانـــم بـــاقـــی ســـت
گـــرچــــه فــــانـــی شـــده ام نـــام و نشــــانـــم بــاقـــی ســـت

منابع ومصادر:

تاریخ مشائخ چشت،خلیق احمد نظامی

دیوان شاہ نیاز بریلویؒ

خزنیۃ الاصفیاءج ا

☆☆☆

شورش عشق نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے

پروفیسر زیبا محمود
صدر شعبہ اُردو گنپت سہائے پی جی کالج سلطان پور
Mob No 9839222385

بیسویں صدی کو تنقیدی نظریات کی صدی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر صنف میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے تخلیقی تجربے ہوئے اور تنقید میں مغرب سے مشرق تک نئے تنقیدی نظریات کی دھوم رہی جس کے زیر اثر ہر تنقید کی نئی کتاب ایک نئے نظریئے کے ساتھ منصہ ٔشہود پر آئی اور تائید و تردید دونوں کا ہنگامہ اور سلسلہ جاری و ساری رہا۔ یعنی نئے نظریات اور تھیوری پر اصرار اس صدی کی خصوصیت رہی۔ عام معنوں میں نظریہ اور تھیوری میں کوئی واضح فرق نہیں کیوں کہ دونوں کے ہی معنی اصول فلسفۂ خیالات ہیں لیکن تھیوری ہمیشہ پرنسپل بیسڈ اور آئیڈیالوجی کا انحصار طرز فکر یا سسٹم پر ہی محیط ہوتا ہے۔

تلاش و تحقیق اور علم و دانش میں کوئی حرف حرف آخر نہیں ہوتا۔ ادب کی تفہیم اور تنقید کے اصول بھی اپنے موقف پر یکساں قائم نہیں رہتے یہی وجہ ہے کہ نظریہ سازوں کے اطلاقی عمل میں تضاد رونما ہوتا ہے۔ نظریہ بے معنی ہے اگر اس کا اطلاقی عمل نہ ہو۔ کسی بھی نقاد کے اطلاقی عمل سے ہی اس کے نظریئے کی سمت اور تشکیل کا پتہ چلتا ہے کیوں کہ میرے نزدیک تنقید صرف محاسن و معائب شماری کا نام نہیں بلکہ تنقید ادب کی تفہیم کا ایک قوی ذریعہ ہے اور تفہیم قرأت متن کی جہت کے تعین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ جہات جتنی روشن ہوں گی ادب کی تفہیم کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع تر ہوگا۔ تنقید پہلے سے ہی کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے معروضی مطالعہ لازمی شرط ہے۔

تنقید میں کہی ہوئی بات کو تولنا بنیادی مقصد رکھتا ہے۔ جانچنے پرکھنے اور تولنے کے لئے دور رس بصارت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی تجربات و مشاہدات کی دنیا الگ ہے لیکن اسی نگاہ تجربہ اور سوجھ بوجھ سے شعر و ادب کی تنقید اور ادب میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اس لئے جہاں خلاق و ادیب کے یہاں تجربے کی صداقت اور اسلوب کی انفرادیت اہمیت رکھتی ہے وہیں نقاد کے تجربے فکر اور نظر میں وسعت و انفرادیت بھی ہونا ضروری ہے اس کی نگاہ میں شعر و ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار کی تصویر ہوتی ہے

اس طرح ادب کا مجموعی مزاج اور اقدار بھی وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کی نیرنگیوں میں پیوست کر دیتا ہے بقول غالبؔ:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ   چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اور اس طرح تنقیدی نظر اور ناقدانہ فکر صرف جذبۂ تخلیق اور اور کسی فن پارے کی تخلیق میں شریک رہتا ہے اور پھر جس دور میں کوئی ادب پارہ تخلیق پاتا ہے اس دور کا اپنا ایک تنقیدی مزاج اور ادبی مذاق صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں فن تنقید نے بے انتہا ترقی کی ہے اس کا سبب انگریزی اثرات ہیں۔انگریزی زبان کی تنقید نگاری کے نمونے دیکھنے کے بعد اردو زبان کے نقاد فن تنقید کی اصل روح سے واقف ہو سکے۔لہٰذا انہوں نے انگریزی تنقید نگاری سے خیالات مستعار لے کر ان کو اردو تنقید کی زینت بنایا۔یہ چیزیں یقیناً بہت اچھی ہیں۔ہمارے یہاں تو دیگر زبانوں کے الفاظ و خیالات کے لئے دروازے کھلے ہیں۔اردو زبان کی حیثیت تو ایسی ہے جیسے ’ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد‘ لیکن اس جذب وانجذاب کی ایک حد ہے۔ہمارے نقادوں کے خیالات پر انگریزی تنقید کا بہت اثر ہے۔وہ غیر زبان کے میزان سے اردو ادب اور اردو تنقید کے سرمائے کو تولنا چاہتے ہیں۔معیار و میزان کی بھی حد مقرر ہونا چاہیے۔یہی طرز نگارش ہمیں مجبور کرتی ہے کہ کوثر مظہری کو موجودہ دور کے نقادوں کے گروہ میں جگہ دیں۔اردو داں طبقہ ان کے تنقیدی جوہر کا معترف ہے جو نہ صرف موجودہ تنقید نگاری کے لئے مفید ہوں گے بلکہ آنے والی نسل کے نقادوں کے لئے مشعل راہ بھی ثابت ہوں گے اس کا اندازہ ہم ان کے فن کے حیرت انگیز ارتقاء سے نکالتے ہیں۔

کوثر مظہری کے اسلوب کا تعلق شخصیت سے گوشت اور ناخن کا ہے۔کوثر مظہری کے فکر و فن میں جو امر حاوی ہے وہ بیک وقت دونوں میں تحریری عمل کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے جس میں قوت تخئیل پیش پیش ہے اور اس کے عمل کی نہج سے خود مصنف کے درجے کا تعین ہوتا ہے۔جس کے تحت ان کے مابہ الامتیاز و محاسن انھیں اوج ثریا عطا کرتی ہے اور ذوق شناسان ادب یہ فیصلہ کرتا ہے مصنف اپنے مقصد اور موضوع کو پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے نیز ان کے دیگر فن پاروں کے مقابلے میں ان کی خلاقی کے مختلف اجزا میں سے کون سا جز وایسا ہے جن میں زیادہ جان داری، ہمہ گیری اور آفاقیت ہے جس سے ان کے ادب پاروں اور کوثر فہمی میں ان کے ابلاغ و اظہار کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیوں کہ ادب فنون لطیفہ کی سب سے زیادہ لطیف اور نازک مزاج شاخ ہے

کوثر مظہری اپنے حواس ظاہری سے بخوبی ادبی کام انجام دے رہے ہیں اس لئے آپ کی نظر فنی نزاکتوں اور مقصد کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے جس سے ان کی معنویت میں بالیدگی پیوست نظر آتی ہے۔ان کی تخلیقات میں حواس خمسہ احساس و ادراک کے دھارے دھوپ چھاؤں کی طرح جلوہ فگن ہیں جن کو شعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور ایسا شعور قدرت ہر فرد کو ودیعت نہیں کرتی اسی

ودیعت فطری کو پروان چڑھانے میں آپ کوشاں ہیں جو آپ کی افتادِ طبع ومزاج سے ہم آہنگ ہوکر فنی محرکات کو مزید واضح کرتی ہے۔ کوثر مظہری کے وجدان وفکر میں جو خارجی حالات اور داخلی کیفیات کا دخل رہا ہے اس کے تجزیئے اور تحلیل کا مطالعہ ضروری ہے جس سے ان کے تنقیدی افکار کی بازآفرینی قرار پاسکے۔ان کی تنقید نگاری کا فن تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ روایتی تنقید سے بھی فیض یاب ہے۔

کوثر مظہری اسرار وآثار میں کوثر فہمی کی قوس وقزحی رنگ پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ یہ تصنیف ان رموز و نکات کی گرہ کشائی ہے جس سے ان کی علمی شخصیت کا ہر ایک پہلو ایک نئے رخ کے ساتھ ذہن کے دریچوں پر دستک دینے میں کامیاب ہے۔ادب سے معیاری شیفتگی ان کا طرہ امتیاز ہے دیکھئے ایک نقاد ایک شاعر ایک ناول نگار اس کی نثر میں کتنی جلوہ سامانیاں موجود ہیں۔مزاج کی شگفتگی اور نرمی لیکن طبیعت میں برق رفتاری فیصلہ کن ہونے میں ذرا دیر نہیں لگتی جہاں ایک طرف اپنے عہد کے معتبر ادیبوں پر رائے زنی کرنا تو دوسری طرف اسلاف کے کارناموں پر آپ کی تحریریں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی ادب شناسی کے قائل قمر رئیس، حامدی کاشمیری، علی احمد فاطمی خواجہ اکرام الدین اور شافع قدوائی نے اپنی دوررس مطالعہ شناسی کا حق ادا کیا ہے۔کوثر مظہری کے قلم کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب جدیدیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جدیدیت میری نظر میں ایک ایسا رجحان ہے جس کا مقصد نئی لسانی وادبی روایت کو فروغ دینا ہے یا یوں کہیے کہ ایک طرح سے روایتی یا کلاسیکی ہیئت، زبان، طریقۂ اظہار اور ہر طرح کے سماجی سائنسی تاریخ اثر سے آزادی۔دی ہوئی جبر کی لکیر کو توڑنے کا ہنر ہے اس لئے اس میں مختلف نظریات ہے ہیں، جیسے علامتیت، اظہاریت، پیکریت اور تجریدیت وغیرہ لیکن جدیدیت ان کے نزدیک پیچیدہ کوشہ ادب ہے۔بڑے دلچسپ انداز میں کہتے ہیں جہاں ایک طرف قصہ پن عنقا ہوگیا وہیں دوسری طرف شمس الرحمان فاروقی نے میر شناسی میں دماغ لگادیا اور پھر بددیانت داری سے تعبیر کرنا۔انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ شمس الرحمان فاروقی نے دومضامین بھی جدیدیت کی نذر نہیں کئے جس سے ادب کا سنجیدہ قاری اور اس کی فہم کے لئے تشفی کا سامان فراہم ہو۔فروفیسر فاروقی سے آپ کچھ نالاں نظر آتے ہیں یہ بڑے دیدیے کی بات ہے لیکن دلچسپی کا سامان فراہن ہوتا ہے جو اردو تنقید کے حوالے سے وقیع تحقیق کا ضامن بن سکتا ہے اور شناسان ادب کے لئے مزید راہ ہموار ہوسکتی ہے۔لکھتے ہیں

> جناب شمس الرحمان فاروقی کہتے ہیں کہ نسل اپنا نقاد خود پیدا کرتی ہے۔شعبہ فکر سے ہی کسی ادبی نسل کا رجحان مترشح ہوتا ہے لہٰذا اس بنیاد پر فاوقی صاحب کا مفروضہ بے معنی ہوجاتا ہے قلی قطب شاہ کی نسل کا بڑا نقاد کون ہے؟ اور اگر اس نسل میں کوئی نقاد پیدا نہیں ہوا تو قلی قطب شاہ کو کیا ضروری تھا کہ پچاس ہزار اشعار کہہ ڈالتے (مسئلہ نقاد پیدا کرنے کا ر ص ۱۷)

آپ کی تحریریں صالح ادب کی ترجمان ہیں جس سے انسانی ذہن کے سمت و رفتار اور روح کی بالیدگی کے موثر اثرات رونما ہونے ہیں۔ جواز و انتخاب میں رقم طراز ہیں:

'فاروقی صاحب کا انداز تخاطب جارحانہ اور رواداری سے عاری ہے اگر ہر سوال کا جواب دیا جائے تو پھر بحث طویل ہو جائے گی' (جواز و انتخاب/ مابعد جدیدیت/ جھوٹا سچ/ ص ۴۱)

انہوں نے اپنے مفروضہ قرار دیا لکھتے ہیں:

'یہ مفروضہ مبنی بر ابہام ہے اس مفروضہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ادبی نسل کا رشتہ بعد کی یا ماقبل کی ادبی نسلوں یا ادب پاروں سے منقطع ہو جاتا ہے' (جرأت و افکار/ مسئلہ نقاد پیدا کرنے کا/ ص ۱۷)

مزید لکھتے ہیں:

'آج کے شاعروں اور ادیبوں سے اپنا نقاد پیدا کرنے کا تقاضا اگر مضحکہ خیز نہیں تو حیرت انگیز ضرور ہے'

(جرأت و افکار/ مسئلہ نقاد پیدا کرنے کا/ ص ۱۸)

زندہ ادب میں تحریکات و نظریات و رجحانات کا آنا جانا فطری عمل ہے اگر چہ میرے نزدیک تخلیقی ادب نظریات کا تابع نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ نظریہ خود ادب کا تابع ہوتا ہے ہمارا کلاسیکی ادب کسی نظریئے کے اتباع کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آج قرأت کے نئے مباحث اور نظریوں کی روشنی میں بھی عظیم ادب عظیم ہی ثابت ہوا ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور انیسؔ جیسے شعرا کو ترقی پسندی، جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کوئی بھی نظریہ کوئی بھی تحریک یا کوئی بھی تنقیدی دبستان نظر انداز نہیں کر سکا اور سچ تو یہ ہے کہ قرأت کے جتنے رجحانات یا شکلیں سامنے آتی رہیں گی ادب کی تفہیم کے دائرے کو وسیع تر ہی کریں گی کیوں کہ تنقید کا کام ادب کی تشریح، تفسیر اور معنی و مفاہیم کو ایک مثبت سمت دیتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی فن پارے کی مختلف قرأتیں ممکن ہیں۔ قرأت متن کی جتنی جہات روشن ہوں گی فن پارے کی تفہیم کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع تر ہوگا۔

کوثر مظہری کی تحریریں توازن اور اعتدال کا سر چشمہ ہیں۔ معنی و مفہوم کی بحروں میں غوطہ زنی ان کا تجزیاتی عمل ان کی خلاقی کو پروان چڑھاتا ہے اس طرح ہر دور کا ادب اپنے دور کے حالات میلانات اور رجحانات کا آئینہ ہے جسے ثقافتی اقدار پر اکتفا ناگزیر ہو جاتا ہے اور کوثر مظہری نے اپنے شعر و ادب کے مطالعے کو ادب کے مختلف زاویوں سے سرشار کیا۔ اپنے دور کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کو بخوبی تسلیم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

'معاشرے میں تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ تہذیب کا تعلق خارجی رسم و رواج سے ہوتا ہے جب کہ ثقافت انسان کی باطنی فکر سے رشتہ ہموار کرتی ہے (قرأت اور مکالمہ/ ص ۲۳۶)

اس طرح مندرجہ بالا اقتباس سے ان کی حیثیت ایک مستند ناقد کی ہو جاتی ہے اور ان کا ادبی قد و قامت صفحہ قرطاس پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ باز دید اور تبصرے سے لے کر جرأت افکار، قرأت اور مکالمہ ارتسام تک آپ کا ادبی و تخلیقی سفر کئی مراحل سے گزرا باز دید اور تبصرے میں شامل تحریریں آپ کے ادبی افق کو متعین کرتی ہیں۔ لکھتے ہیں

> ۱۹۹۴ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک میں نے بہت تبصرے لکھے۔ دہلی آ کر لکھنے پڑھنے کے مواقع بہت ملے رسائل و جرائد کے مدیران تبصرے کے لئے آسانی سے کتابیں نہیں دیتے لیکن دھیرے دھیرے میرے تبصرے آج کل، ایوان اردو، ہماری زبان، کتاب نما اور زبان و ادب میں چھپنے لگے۔ کتاب نما کے مالک شاہد علی خاں صاحب اور کتاب کے مالک اور مدیر ایک ساتھ پانچ کتابیں دیتے اور کہتے کہ دونوں پر تبصرے لکھ کر دے دیجئے، کوئی اور کام نہیں تھا تو کتابوں کی ورق گردانی کر کے کچھ سرسری اور کچھ بغائر تبصرے لکھ دیتا شوق کچھ یوں بڑھا کہ تبصرے کرنے کے لئے دہلی اردو اکادمی اور انجمن ترقی اردو پر کتابیں مانگنے چلا جاتا۔ فائدہ یہ ہوا کہ اسی زمانے میں کچھ اچھی اور کچھ بری کتابیں پڑھنے اور دیکھنے کا موقع ملا چونکہ ریسرچ اسکالر تھا اس لئے مدیر اچھی اور معیاری کتب دیتے ہوئے عار محسوس کرتے۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ مجھے جو کتابیں بھی مل جاتی انھیں نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتا۔ ۱۹۹۸ء میں جب لیکچرر بن گیا تو تبصرہ نگاری کی رفتار کم ہو گئی لیکن قارئین آپ ہرگز تصور نہ کرلیں کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا بلکہ مضامین، سیمینار اور کتاب لکھنے کی طرف توجہ زیادہ کرنے لگا (باز دید اور تبصرے رص ۱۲)

مبصر کے لئے تنقیدی بصیرت اور شعور و آگہی کو بنیادی مبادیات قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں:

> تبصرہ نگاری خدانخواستہ اشتہار بازی یا کتاب اور صاحب کتاب کی سستی شہرت کے لئے استعمال کرتے ہیں ا نہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ایسے اشتہاری تبصرے کی قلعی امتداد زمانہ کے بعد کھل ہی جاتی ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ اندازہ ہوا ہے کہ اچھا تبصرہ ہمیشہ اچھی تنقیدی بصیرت پر منحصر بھی کرتا ہے اور اس کی غمازی بھی اس لئے میں تبصرے کو تنقید کا زینہ تصور کرتا ہوں (باز دید اور تبصرے رص ۱۳ ۱۴)

تنقید کے طریقۂ کار پر آپ کا زاویہ نظر کافی قابل اعتماد ہے جس سے مثبت تنقید کے ساتھ مثبت قرأت کے نقوش وجود پذیر ہوئے۔ قاری متن اور قرأت کے رشتے کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تنقید کسی بھی متن کی قدر شناسی Evaluation کا عمل ہے

قرأت اور مطالعہ عملی تنقید اور تفہیم شعر و شاعری پر آپ کے خیالات پر مغز ہیں۔ متن کی صحیح اور مناسب قرأت اور تنقیدی مکالمہ بصیرت آمیز ہے جو ناقدانہ انفراد کو مستحکم کرتا ہے اور یہ تنقیدی استدلال ان کی خلاقی کے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

قرأت سے صرف معنی کی پرتیں ہی نہیں کھلتیں بلکہ متن کا تہذیبی وثقافتی اور سیاسی اور سماجی سیاق ابھرتا ہے ۔جس میں متن خلق ہوا ہے۔متن بنانے والے کی ذہنی ساخت اور اس کے نجی محسوسات اور اس کے نجی محسوسات اور جس ماحول کا وہ پروردہ ہے وہ بھی متن کی چادر سے جھانکنے لگتا ہے۔جو قاری جس قدر اعلیٰ ذوق اور علمی وفور سے لیس ہوگا متن کے باطن میں اتر کر اس کے خزانے تک اسی حد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا (قرأت اور مکالمہ؍ص ۱۱)

میرا ذاتی ادراک اور Perception تو یہ ہے کہ متن کی قرأت کے لئے کسی بھی ائیر فریش، دریدہ، بارتھ ،لاکاں ،فوکو کی قطعی ضرورت نہیں ،ہاں آپ کے اپنے شعور کی بالیدگی اور Episteme کی اہمیت ضرورت ہے (قرأت اور مکالمہ؍ص ۲۴)

بیشک قاری کو یہ آزادی ہے کہ وہ متن سے معنی اخذ کرے اور اپنی طرح کرے لیکن وہ اس قدر بھی آزاد نہیں کہ اس متن کو اس کی اصل سے اتنی دور لے جائے کہ متن اور اس میں سانس لیتے ہوئے تہذیبی اور ثقافتی نشانات و علامات Culturalsign کلچرل سائن کا دم پھولنے لگے۔ (قرأت اور مکالمہ؍ص ۱۴)

اس طرح قرأت کے متعلق آپ کا استدلال تنقید وتحقیق کے صیغے میں کئی امور وا کرتے ہیں ۔قرأت ان کے نزدیک خاموشی اور یک سوئی کا عمل ہے ۔وہ کسی خاص مکتبۂ فکر کے حامی نہیں ہیں لیکن ان کا ادب سے وابستہ تمام رجحانات اور میلانات کا غائر مطالعہ اس بات کا مصداق ہے کہ آپ ادب کے تخلیقی منازل اور اس کے زیر اثر متن ادب اور قاری پر ہی آپ کا زاویہ تنقید محیط ہے ۔متن میں الفاظ کے دروبست،نشست و برخاست، محاکات، تفحص الفاظ کا مطالعہ باریک بینی پر مبنی ہے۔آپ کی تحریروں کا بے باکانہ انداز، دو ٹوک انداز میں برتنا آپ کا خاصہ ہے۔آپ مجادلے اور مناظرے کے قائل نہیں ۔پورے منطقی استدلال کے ساتھ تجزیاتی مباحث کا حصہ ہیں ۔تفہیم وتعبیر وتشریح وتوضیح کے معیار ومیزان پر آپ کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔کوثر فہمی کا یہ رخ ان کی علمی دیانت داری کے معترف اس عہد کے تمام بڑے سخنوروں کی دلیلوں کا حصہ بنیں یہ قابل رشک ہے۔اس طرح قاری قرأت مکالمہ کے آداب پر آپ کی گرفت مضبوط ہے اور مطالعہ بھی وسیع ہے۔متن کی ہم آہنگی کے معترف ہیں اور تینوں کو ایک دوسرے کا ہمراز قرار دیتے ہیں جوان کے غائر مطالعے کا غماز ہے۔تخلیق اور تنقید پر بھی اپنے خیالات ونظریات کو رسالہ کسوٹی جدید میں کیا ہے۔تخلیق اولیت کا درجہ رکھتی ہے

اور یہیں سے تشریح وتعبیر کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔فرماتے ہیں:

اگر آج کی تنقید کی روشنی میں دیکھا جائے تو تخلیق کسی وجدانی معنی سے آگے کثیر معنوی یا کثیر الابادی ہوتی ہے (کوثر مظہری/احوال وآثار/ص۱۱۲)

ادبی مسائل پر جس اعتماد کے ساتھ رائے زنی کرتے ہیں اس سے ان کی دانشورانہ شخصیت اجاگر ہوتی ہے بطور خاص شعر کے تجزیاتی مطالعے پر آپ کی فطانت حاوی ہے۔ لامتی ساخت پر آپ کی تحریروں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔لکھتے ہیں:

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ شاعر دم تخلیق کسی معنوں سے سروکار نہیں رکھتا۔شاعر کبھی لفظوں سے تو کٹ سکتا ہے لیکن معنی سے نہیں۔معانی اگر بطن شاعر میں نہ ہوں تو جولانی طبع ماند پڑ سکتی ہے وپ معانی ہی ہوتے ہیں جو اپنے مطابق الفاظ وتراکیب تلاش کرتے ہیں معانی کی موت الفاظ کی موت ہے (قرأت ومکالمہ/ص۴۴۔۴۵)

اس طرح شعر کا تجزیاتی مطالعہ اور محاکمہ دونوں پر آپ کو دسترس حاصل ہے متن پر آپ کی ناقدانہ تحریریں غور وخوض کی دعوت دیتی ہیں لفظ اور متن پر تہہ دار گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شعر یا نظم کو پڑھتے ہوئے لفظوں اور ترکیبوں کے نظام کو سمجھنا ان کے واضح اور مبہم تناظرات کی جستجو کرنا اور پھر ان کی تشریح وتعبیر کے لئے اپنے خزانۂ الفاظ کو تلاش کرنا محض Passivley موجود نہیں ہوتے بلکہ ان کا Activer Role بھی ہوتا ہے (قرأت ومکالمہ/ص۳۱)

قرأت کی اہمیت وافادیت پر آپ کے افکار ونظریاتا آپ کے مشاہدۂ ذوق کو جلا بخشتے ہیں۔رقم طراز ہیں:

قرأت سے صرف معنی کی پرتیں ہی نہیں کھلتیں بلکہ متن کا وہ تہذیبی وثقافتی اور سیاسی اور سماجی سیاق بھی ابھرتا ہے جس میں متن خلق ہوتا ہے (قرأت ومکالمہ/ص۹)

اس طرح علم کی آفاقیت تسلیم کرنے والے کوثر مظہری کا متن پر استدلال آپ کا خاصہ ہے جو دھوپ چھاؤں کی طرح آپ کی تصانیف میں جلوہ گر ہیں متن کے تئیں آپ کے مرتب کردہ ذہن کی جولانیاں مندرجہ ذیل اقتباسات سے صاف عیاں ہیں

(۱) متن کی فطرت چوں کہ داخلی ہوتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں متن ہی متن کا تعین کرتا ہے۔

(۲) شاعری یا شعر کے معنیاتی نظام تک رسائی کے لئے جو اصولی Devices ہو سکتے ہیں ان میں اہم ترین استعاراتی متن تک رسائی حاصل کرنا ہے

آپ کا تنقیدی رویہ کسی ازم کے تحت نہیں ہے آپ کا خلاقی ذہن آپ کے تنقیدی شعور کی بالیدگی اور پختگی کو کسی ایک مکتبۂ فکر میں سمویا نہیں جا سکتا بلکہ آپ کے ذہن وقالب کی وارفتگی اردو ادب کے لئے نئے امکانات سے روبرو کراتی ہیں اور اہل ادب کے لئے ایسا

اثاثہ ہے جس سے معنی ومفہوم کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔کوثر مظہری کا بیدار ذہن ہمیں ہر لحظہ تہذیب اور روایات کی پاسداری دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ایسا نہیں کہ وہ مغرب سے بیزار تھے وہ مغرب کے پرتو تو ضرور ہیں لیکن وہ مشرق ومغرب میں امتیاز نہیں کرتے۔ان کی جرأت افکار اور جرأت گفتار کو تسلیم کرنا چاہیے کیوں کہ بقول ممتاز حسین ایسے زاویے انہیں Dynamic اور Dashing بناتے ہیں آپ خلاق اور اس کی تخلیق کی زبان کی سراغ رسانی ،لفظ اور معنی کے رشتے ،موضوع ، ہیئت ،مزاج سب کو تنقید کے قالب میں سمونے کی کوشش میں کامیاب ہیں۔وجودیت کو جہاں سارتر نے Being with other سے موسوم کیا ہے وہیں کوثر مظہری وجود کو آندھی قرار دیتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> وجودیوں نے ایسی آندھی چلائی کہ ایک ہل چل سی پیدا ہوگئی اور پھر چیخ ،گریہ وزاری ،اجنبیت ، بے چینی ، تشکیک اور بیگانگی نے روح انسانی پر دھاوا بول دیا۔ایسا نہیں ہے کہ موضوعات اب خرچ ہو چکے ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہماری زندگی کا حصہ ہیں اور یہی جواز ہمارے آدمی ہونے کا اور ہماری شاعری کا بھی ہے(جواز وانتخاب رص ۱۲)

اس طرح آپ کا کوئی خاص پابند اصول یا معیار یا فکری رویہ متعین نہیں ہے لیکن آپ کی تہہ داری بصارت تسلیم کا درجہ رکھتی ہے

کوثر مظہری کا مطالعہ اس بات کا مصداق ہے کہ ان کے نظریے ،امکانات یا خیالات کے مشاہدے کو اگر محض نثر کی روشنی سے دیکھا جائے تو ان کی نثر کا مطالعہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دل چسپی کا وہ پر کیف مرکب ہے جس کو پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن لطف وانبساط سے سرشار ہو جاتا ہے اس طرح کوثر فہمی کا مطالعہ اس امر کی نشان دہی کا مرکز ہے کہ کسی بھی فن پارے کی معرفت یا کسی عہد کے ادب کی شناسائی الفاظ کی گہرائیوں اور تہہ داریوں تک پہنچے بغیر ممکن نہیں ہے کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو جمالیاتی عمل کی صحیح تصویر بنتی ہے اور نہ سماجی اثر پذیری کی کیوں کہ الفاظ اپنے معنی میں آزاد ہیں۔

الغرض آپ کا تجزیاتی جواز اہل علم اور شائقین ادب کے لئے ایک درخشاں ستارہ ہے اس سنگ میل سے روشنی حاصل کیجئے یا یوں کہئے کہ شورش عشق نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے۔

☆☆☆☆☆

ابوالفیض عثمانی اورراجستھان میں اردوزبان وادب کے لئے غیرمسلم حضرات کی خدمات ایک مطالعہ

ڈاکٹرای۔اے۔حیدری
ایسوسی ایٹ پروفیسر،شعبہ اردوگورنمنٹ لوہیا کالج چورو

آزادی کے بعدراجستھان میں اردوزبان وادب کی بقاوفروغ میں جن افراد نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں ابوالفیض عثمانی کا نام بہت نمایاں ہے۔راجستھان میں اردوزبان وادب سے وابستہ موجودہ نسل کی آبیاری میں ان کا نام آب زر سے لکھا جانا چاہیے اگر میں یہ کہوں کہ وہ استاذالاساتذہ ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔راجستھان میں اردودرس وتدریس سے وابستہ موجودہ نسل میں شاید و باید ہی کوئی ایسا ادیب وشاعر ہوجس نے بالواسطہ یا بلا واسطہ راجستھان کے بابائے اردو سے استفادہ نہ کیا ہو ۔راجستھان میں اردوزبان ادب کے گنج ہائے گراں مایہ کی تلاش وجستجو میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ صرف کیا۔انسانی زندگی میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے جہاں پہنچ کرانسان اپنی تمام تر ذمہ داریوں عہدہ برآ ہوکرچین وسکون کی زندگی کا خواہش مند ہوتا ہےمگرعثمانی صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اردوزبان کے مجاہد بنے رہے۔تحقیق ان کا محبوب موضوع تھااس موضوع پران کی نصف درجن سے زائدتصانیف منظرعام پرآچکی ہیں اس کےعلاوہ مطبوعہ مقالات ومضامین کی ایک طویل فہرست ہےجس میں راجستھان کی ادبی،تہذیبی اورثقافتی جھلکیاں اپنے رنگ بکھیرتی ہیں

ڈاکٹرعثمانی صاحب درس وتدریس کےشعبہ سےوابستہ تھےاور ہمہ وقت تشنگان علوم کی سیرابی کے لئے آمادہ رہتے۔خاص طور پرراجستھان سے وابستہ ادبی موضوعات پرکام کرنے والوں کی معاونت کے لئے ہرطرح تیاررہتے

راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لئے غیرمسلم حضرات کی خدمات ابوالفیض عثمانی کاتحقیقی مقالہ ہے جس پر راجستھان یونیورسٹی جے پور نے ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ابوالفیض عثمانی صاحب نے یہ مقالہ مشہورترقی پسند شاعرمعین احسن جذبی ریڈرشعبہ اردومسلم یونیورسٹی کے زیرنگرانی تحریرکیا۔یہ مقالہ دس ابواب پرمشتمل ہے۔پہلے باب میں گیارھویں

صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں میں فارسی زبان وادب کی تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے جسے بعد میں اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں راجستھان میں فارسی زبان وادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات کے عنوان سے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔اس کے بعد اسی باب میں بیس صفحات میں سولہویں صدی سے ۱۹۴۷ء تک اردو زبان وادب کی ارتقائی صورت حال کا جائزہ پیش کیا ہے۔راجستھان کے مختلف علاقوں میں تصنیف وتالیف اور شعر وادب سے وابستہ حضرات کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔جن کی روشنی میں محققین نے شعر وادب کی بہت سی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کا عمل انجام دیا۔بہت سے شعراء وادباء کے خاندانی وسوانحی حالات،سلسلہ تلمذ وادبی خدمات منظر عام پر آئے۔مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ،خواجہ حیدرعلی آتشؔ اور نواب مرزا داغؔ دہلوی کے متعدد شاگردوں نے راجستھان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں جس طرح اردو شعر وادب کی شمع روشن کی اس کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔جس پر بعد کی نسل نے بعض وقیع اور معیاری مقالے لکھ کر ابوالفیض عثمانی کو واقعی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

دوسرے باب میں آزادی کے بعد جے پور کے ادبی پس منظر پر بھر پور روشنی ڈالی ہے اور تین درجن غیر مسلم شعراء کا انفرادی تذکرہ کرنے کے بعد چھ درجن شعراء کے نام،تخلص اور ماخذ وغیرہ کی نشان دہی کی ہے۔ابوالفیض عثمانی نے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خاندانی حالات وطن،تلمذ،ادبی خدمات،انتخاب کلام،خصوصیات کلام اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرے کئے ہیں جس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرے باب میں ریاست جودھ پور کا ابتداء ادبی پس منظر بیان کرنے کے بعد ایک درجن سے زائد غیر مسلم شعراء وادباء کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ان کے علاوہ نصف درجن شاعروں کے نام،تخلص اور حوالہ جات کی نشان دہی کی ہے۔

چوتھے باب میں بارہویں صدی سے ۱۹۴۷ء تک ریاست بھرت پور کا تاریخی وادبی پس منظر بیان کرنے کے بعد ۱۹۴۷ کے بعد کے ایک درجن غیر مسلم شعراء کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہے اس کے بعد دو درجن کے قریب شعراء کے نام، تخلص اور ماخذ اور حوالے پیش کئے ہیں جو نووارد محققین کے لئے بھرت پور کی شعراء وادبا کے بارے میں بنیادی معلومات کی فراہمی میں معاون ومددگار ثابت ہوں گے۔ڈاکٹر نصرت فاطمہ نے راجستھان کے رثائی ادب پر جو تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس کی بنیاد میں ابوالفیض عثمانی کا زیر نظر مقالہ ہی دکھائی دیتا ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ ۱۹۷۰ء کے بعد راجستھان میں اردو شعر وادب کے حوالے سے جو تحقیقی وتنقیدی کام ہوئے ہیں ان کی رہبری ورہنمائی میں ابوالفیض عثمانی بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔

پانچویں باب میں ابتداءً ریاست الور کے وجود میں (۱۷۷۵ء) آنے سے ۱۹۴۷ء تک کی سماجی تاریخی وادبی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے اور گزشتہ ریاستوں جے پور، جودھ پور اور بھرت پور کے فرماں رواؤں کی طرح الور کے فرماں رواؤں کی علمی وادبی

سر پرستی، مذہبی رواداری، باہمی اتحاد و اتفاق کی روش کو اجاگر کرتے ہوئے وہاں کے شعراء واد باء کا تعارف کرایا ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں جس سے وہاں کے لسانی امتیازات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ ریاست الور کے دو درجن کے قریب غیر مسلم شعراء کے بارے میں تفصیلی و اجمالی نشاندہی کی ہے۔

چھٹے باب میں راجستھان کی مسلم ریاست ٹونک کے وجود میں آنے سے لے کر ملک کی آزادی تک کی سماجی معاشرتی، علمی وادبی صورت حال بیان کی ہے۔ یہاں کے نوابین نے علم وادب کے فروغ میں جو نمایاں کردار ادا کیا اس کے نقوش ٹونک میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیبی روایات کا ہی اثر ہے کہ یہاں آج بھی غیر مسلموں میں اردو زبان وادب سے دلچسپی موجود ہے۔ غیر مسلم طلبہ کی ایک کثیر تعداد پرائمری سطح سے اعلیٰ تعلیمی سطح تک اسکولوں اور کالجوں میں دکھائی دیتی ہے۔ موصوف نے یہاں کے ایک درجن غیر مسلم شعراء کی شعری وادبی خدمات کا زیر نظر مقالے میں تذکرہ کرنے کے بعد کچھ شعراء کے نام، تخلص، ماخذ اور حوالوں کی نشان دہی کی ہے۔ امید ہے کہ ٹونک کالج سے وابستہ غیر مسلم اساتذہ اپنے آباواجداد کے کارناموں کو منظر عام پر لائیں گے اور ابوالفیض عثمانی کے اس خیال کو حقیقت کا عملی جامہ پہنائیں گے کہ اردو زبان وادب نے ہر دور اور ہر علاقے میں اتحاد و اتفاق کی شمع روشن کی ہے اور ملک میں قومی یک جہتی اور رواداری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں

مقالے کے ساتویں باب میں جھالاواڑ اور آٹھویں باب میں ریاست کوٹہ کے کے وجود میں آنے سے آزادی تک کی تاریخی، سماجی وادبی صورت حال کا بیان کیا ہے اور یہاں کے غیر مسلم فرمانرواؤں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ راجستھان کے غیر مسلم فرمانرواؤں کی کشادہ قلبی نے عوام الناس کو اردو زبان وادب کا دلدادہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ راجستھان کی ان ریاستوں میں غیر مسلم شعراء و ادبا کی قابل ذکر موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو زبان وادب کے دلکش حسن کا جادو ابھی بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

زیر نظر مقالے میں جھالاواڑ سے نکلنے والے رسالے آفتاب میں غیر مسلم ادیبوں کی شمولیت اور نصف درجن سے زائد غیر مسلم شعراء کا تذکرہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عوام میں اردو زبان وادب کی تعلیم عام تھی۔ بلا تفریق مذہب وملت لوگ اردو میں مضامین لکھتے اور شعر کہتے تھے۔ ریاست کوٹہ کے تعلق سے عثمانی صاحب نے ایک درجن سے زائد غیر مسلم شعراء کا تذکرہ کرنے کے بعد اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ریاست کی سرکاری زبان فارسی و اردو ہونے کے باوجود یہاں اردو کی ترقی و فروغ مقامی افراد کے بجائے بیرونی افراد کی رہین منت ہے۔ یہاں نثر کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی۔ صرف للتا پرشاد شاؔد نے جزوی طور پر اردو نثر کی جانب توجہ کی ہے۔

مقالے کے آخری دو ابواب میں اجمیر اور راجستھان کی باقی ماندہ چھوٹی ریاستوں میں غیر مسلم افراد کی شعری و ادبی

خدمات کا تذکرہ کیا ہے ۱۵۴ء میں راجہ اجے نے اپنے نام پر اجمیر کو آباد کیا تھا اس سے اجمیر کی قدامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے قیام سے بارھویں صدی کے اختتام تک اس علاقے میں چوہان خاندان کی حکومت رہی ،اس کے بعد پندرھویں صدی کے نصف تک سلاطین دہلی کے زیر اقتدار رہا ، پھر تقریباً نوے برس اس پر شاہان مالوہ کی حکمرانی رہی ، کچھ عرصہ یہ راجگان مارواڑ کے قبضہ میں بھی رہا ۱۵۵۰ء سے ۱۷۱۹ء تک سلاطین مغلیہ کا تسلط رہا۔اس کے بعد ایک صدی تک اس پر مہاراجگان مارواڑ وغیرہ کا قبضہ رہا پھر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

ابوالفیض عثمانی نے انگریزی حکومت کے قبضہ سے آزادی ملنے تک کے سوا سو سال سے کچھ زائد عرصہ میں یہاں کے چالیس کے قریب غیر مسلم شعراء وادباء کی نشان دہی کی ہے ۔اس کے بعد آزادی کے بعد کے چار درجن کے قریب شاعروں کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچائی ہیں چودہ شاعروں کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد نمونہ کلام اور تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے ان میں سے چند اردو کے ایسے عاشقوں کا بھی تذکرہ ہے جو اردو رسم الخط سے ناواقف تھے

اجمیر میں غزل کی کلاسیکی روایات کی پاسداری، داغ دہلوی کے رنگ سخن کی مقبولیت اور خواجہ اجمیر کی تعلیمات کے زیر اثر تصوف کی رنگ آمیزی کی نشاندہی بھی ابوالفیض نے اپنے مقالے میں کی ہے ۔موجودہ دور کے غیر مسلم شعرائے اجمیر نے عصری تقاضوں کی قدر کرتے ہوئے اپنے کلام کو جن نئے سانچوں میں ڈھالا ہے اس پر بھی انہوں نے تبصرہ کیا ہے۔

مقالے کے آخری حصہ میں اودے پور، بوندی، بیکانیر، پرتاپ گڑھ ، دھول پور، شاہ پورہ، قرولی، کشن گڑھ، ٹھکانہ سیکر، ٹھکانہ کھیتڑی میں بھی غیر مسلموں کی شعری وادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے

مقالے کا عنوان تو راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات ہے مگر یہ راجستھان کی ریاستوں کی تاریخ ،راجستھان کی سماجی ، سیاسی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ اور راجستھان کی گنگا جمنی اتحاد و اتفاق کی وہ وراثت بھی ہے جس کی بدولت راجستھان کی تاریخ میں ابوالفیض عثمانی کا نام آب زر سے لکھا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

تفہیم وترسیل: ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد شاہد پٹھان
جے پور
9372843907

'فاروق بخشی' گزشتہ چند برسوں سے ''پروفیسر فاروق بخشی'' کے نام سے معروف ہیں۔ کالج اور یونیورسٹی کا ہر استاد فطری طور پر ''پروفیسری'' کے مقام ومنصب کا آرزومند ہوتا ہے۔ دانش گاہوں کے موجودہ system کے مطابق تقریباً ہر استاد اپنی ملازمت کے آخری پڑاؤ میں 'پروفیسر' کے سابقے سے ملقب ضرور ہو جاتا ہے ان میں جو اساتذہ زیادہ بہرہ مند ہوتے ہیں وہ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار پروفیسری کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ کرشمہ کیوں کر ظہور میں آتا ہے اس کا سراغ پانا تو دشوار ہے تاہم فاروق بخشی صاحب اس اعتبار سے واقعی خوش نصیب ہیں کہ وہ بیک وقت دو دانش گاہوں (M L S یونی ورسٹی ،ادے پور اور MANUU ،حیدرآباد) میں مکرر 'پروفیسر' مقرر ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیاوی لحاظ سے یقیناً یہ فخر وطمانیت کی بات ہے کہ ہر استاد کے مقدر میں یہ اعزاز نہیں ہوتا ہے۔ بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ ہر لائق اور مستحق استاد زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور پروفیسری کے منصب سے سرفراز ہو۔ (آمین !)۔ پروفیسر کی حیثیت اور منزلت کی بات چل نکلی تو لامحالہ دہلی یونیورسٹی کے ایک قابل استاد پروفیسر ابن کنول (جو کہ پروفیسر گر بھی ہیں) صاحب کا لکھا ہوا انشائیہ ''میں ایک پروفیسر ہوں'' ذہن میں آتا ہے۔ اس کے یہ جملے خاص طور پر رمز کشا ہیں:

گزشتہ صدی میں پروفیسریت تک پہنچنا مشکل عمل سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک کو یہ خطاب یا اعزاز نہیں حاصل ہوتا تھا ،دراصل اس زمانے میں پروفیسریت کے لیے صلاحیت اور اہلیت دیکھی جاتی تھی۔اس وجہ سے بعض ایسی شخصیات بھی پروفیسر ہوگئیں جن کے پاس پی ایچ ڈی کی سند نہیں تھی۔

'گزشتہ صدی میں قریب ستر کی دہائی میں ہماری یونی ورسٹیوں میں پروفیسروں کا قحط تھا۔ضابطوں میں ترمیم کے بعد اس قحط سے بھی نجات ملی اور مستقل صدر یا چیئرمین سے بھی چھٹکارا نصیب ہوا اور اب تو لفظ پروفیسر کے کثرتِ استعمال کے بعد اس لفظ کی وقعت ہی نہیں رہی۔''(بساطِ نشاطِ دل۔ازابن کنول)

بلاشبہ ہماری دانش گاہوں میں(Promotion Schem)ایک سے بڑھ کر ایک پروفیسر براجمان ہیں۔ان میں بعض تو اتنے نازک مزاج ہیں کہ پروفیسر بننے کے بعد لکھنے پڑھنے سے بالکل بری الذمہ ہوگئے ہیں وہ کبھی کبھار کسی سیمینار وغیرہ میں جلوہ افروز ہوتے بھی ہیں تو مضمون لکھنے کی نہیں صرف 'پڑھنے' کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔بعض ان سے بھی عالی مرتبت ہیں جو فقط 'صدارتی تقریر فرما کر ہی سرخ روئی' محسوس کرتے ہیں۔مقام شکر ہے کہ فاروق بخشی صاحب کا شمار ایسے اساتذہ میں نہیں ہوتا۔وہ اصلاً میرٹھ اور دہلی کے علمی وادبی ماحول کے پروردہ ہیں۔اپنی طالب علمی کے زمانے سے جلسے برپا کرتے آئے ہیں۔انھیں قدرت نے ایسی صلاحیت عطا کی ہے کہ کسی بھی موضوع پر دس پندرہ منٹ کی اچھی خاصی تقریر کرنے اور پانچ سات صفحات کا مضمون آسانی سے لکھ لینے میں کامیاب ہیں۔موصوف کے مضامین خاکوں اور تبصروں پر مشتمل تینوں کتب(1)مفاہیم 2004(2)معانی ومطالب 2017(3)اور تفہیم و ترسیل 2022اس کی واضح مثالیں ہیں۔

پروفیسر فاروق بخشی نے اپنی سابقہ کتابوں کی طرح زیر تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں ازراہِ انکسار اس خیال کا اعادہ کیا ہے کہ:

''بنیادی طور پر میں نقاد نہیں ہوں۔تنقید کے لیے جس فکر ونظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ میں اپنی ذات میں نہیں پاتا۔لیکن پیشہ ورانہ ضرورتوں کے تحت درس وتدریس سے وابستہ فرد کو کوچۂ تنقید میں قدم رکھنا پڑتا ہے۔لہٰذا مضامین کی کثیر تعداد جمع ہوجاتی ہے۔''(تفہیم وترسیل۔ص:10اشاعت 2022)

اسی طرح 'معانی ومطالب' کے 'ابتدائیہ' میں نثر نگاری سے متعلق اپنی ذہنی رغبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مفاہیم میں شامل مضامین پر میرے کرم فرماؤں کے تاثرات نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔اسی حوصلہ افزائی کی بدولت میری توجہ نثر لکھنے کی طرف مبذول ہوئی ورنہ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ میں بنیادی طور پر شاعر ہوں۔ لہٰذا میرا براہ راست رشتہ تخلیق سے ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نثر نگاری یا تنقید نگاری کو کوئی کمتر درجے کی چیز سمجھتا

ہوں، بلکہ ہمیشہ سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ اچھی شاعری کے لیے اچھی نثر پڑھنا اور تخلیقی نثر میں اظہارِ خیال کرنا شاعری سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔''(معانی ومطالب۔ص:9۔اشاعت:2017)

میرے خیال سے کوئی بھی تخلیق کار (شاعر) تھوڑی بہت مشق کے بعد نثر لکھنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔فاروق بخشی بھی اس ادبی رمز سے آگاہ ہیں،ان کی نثری تحریریں اس کا بین ثبوت ہیں۔ایک 'فطری شاعر' درحقیقت نام نہاد محقق نقاد اور افسانہ نگار سے زیادہ 'خوش مزاج' اور 'خوش فکر' ہوتا ہے۔فاروق بخشی کے احباب وآشنا ان کی شخصیت کی دل کشی اور شگفتگی سے واقف ہیں۔خوش طبعی کی یہی صفت و کیفیت دراصل ان کی نثر نگاری میں بھی موجزن ہے۔تخلیق کار ہونے کے ناتے وہ زیرِ مطالعہ تخلیق (اور تخلیق کار) کا کھلے دل سے اعتراف واستحسان کرتے ہیں۔بعض اوقات ان کا رویہ تنقید سے زیادہ تحسین آمیز ہوجاتا ہے۔جس کا سلسلہ ہماری تاثراتی اور جمالیاتی تنقید سے جاملتا ہے۔

بخشی صاحب نے اپنے اسلوب نقد اور تخلیق وتخلیق کار کے طریقِ مطالعہ کی بابت اظہارِ خیال کیا ہے:

''فن کار کی شخصیت میرے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے۔ایک بار آپ فن کار کی ذہنی تربیت کے داخلی اور خارجی سرچشموں تک رسائی حاصل کرلیں تو فن پارے کی تفہیم کے راستے خود بخود ہموار ہوجاتے ہیں.....میرا رویہ ادبی تحریکات رجحانات اور رویوں کے تئیں ہمیشہ مثبت رہا ہے۔لہٰذا ترقی پسندی سے لے کر مابعد جدیدیت تک میں نے تمام نظریوں اور ادبی رویوں کو اپنی بساط بھر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے مثبت اثرات کو اپنی فکر کے ساتھ لے کر آگے بڑھا ہوں۔''(معانی ومطالب۔ص:10)

''میرے نزدیک اس بات کی اہمیت بنیادی ہے کہ کسی فن پارے کو پڑھ کر آپ کے ذہن پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، کیوں کہ میں براہِ راست تخلیق اور تخلیق کار کی شخصیت کے حوالے سے متن کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔اسی لیے شخصیات پر لکھے گئے مضامین میں شخصیات اور سوانحی کوائف بھی زیرِ بحث آگئے ہیں۔''جدید غزل میں تخلیقی اظہار کی جہتیں اور بشیر بدر''، ''احتجاج کی آخری آواز راحت اندوری''، ''کیول دھیر اور ان کا افسانہ دہشت، تجزیے کی نظر سے''، ''آہ عظیم بھائی''، ''پروفیسر فضل امام کی یادیں''، ''ڈاکٹر خلیق انجم: کچھ یادیں کچھ باتیں'' اور ''قومی شاعری کا گل سرسبد: گلزار دہلوی'' کو اسی زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔(تفہیم وترسیل۔ص:11)

فاروق بخشی اپنے ادبی آغاز کار سے ہی 'ترقی پسند نقطۂ نظر' سے متاثر رہے ہیں۔ان کے احباب واساتذہ میں بھی بیشتر ترقی پسند ادبا وناقدین شامل ہیں۔تاہم ان کے تخلیقی عمل اور تنقیدی مطالعات میں نظریاتی ادعائیت، بلند آہنگی اور اکہری جذباتیت کا عمل دخل نہیں ہے۔وہ ترقی پسند انداز نقد سے استفادہ تو کرتے ہیں مگر اس کے مبلغ نہیں بنتے۔یہی سبب ہے کہ انھوں نے اختر شیرانی سے

لے کرڈاکٹرعبدالعلیم،بشیر بدؔر،ندافاضلیؔ،گلزار دہلوی ایسے سینئر ادباوشعرا کے ساتھ ہی ساتھ منصورؔعثمانی،راحتؔ اندوری،شین کاف نظامؔ،ابن کنول اورفریدؔ پربتی ایسے نئی نسل کے ادباوشعرا کے تخلیقی اظہارات کامعروضی مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔بخشی صاحب کے بیشتر مضامین شخصیات پرمشتمل ہیں چنانچہ فطری طور پران میں ’خاکہ نگاری‘ کے خصائص وعناصر درآئے ہیں۔کسی بھی ادیب اور ادب پارے پر وہ کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کی فکری جہت اور انفرادیت کی نشان دہی ہوجاتی ہے۔’تفہیم وترسیل‘ میں:بشیر بدر،راحت اندوری،مجتبیٰ حسین،پنڈت ہری چند اختر،پروفیسر فضل امام،خلیق انجم،گلزار دہلوی،صابر گودڑ اور پروفیسر ظفرالدین وغیرہم پرتحریرکردہ مضامین میں ’خاکہ نگاری‘ کے ساتھ ہی مصنف کا انسانیت پسند اورفطری طریق مطالعہ بروئے کار آیاہے۔بڑوں بزرگوں کی خدمات اورخوبیوں کا دیانت دارانہ اعتراف ادبی وتنقیدی مطالعے کی اخلاقیات میں شامل ہے۔اسی خیال کے پیش نظر فاروق بخشی نے ہرمکتبۂ فکر کے ادباوشعرااورناقدین ومحققین کے مطالعات میں دیانت دارانہ اورروادارانہ طریق کاراپنایاہے۔چنانچہ ایسے ہی مطالعات کے مدنظر پروفیسرابن کنول نے فاروق بخشی کے اسلوبِ نقد کے متعلق لکھاہے:

’’فاروق بخشی کی یہ خوبی ہے کہ ایک طرف جہاں وہ خوش فکر شاعر ہیں وہیں شگفتہ نثر نگار بھی ہیں۔ان کی یہ شگفتہ مزاجی ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کی تنقید کسی طرح کی نظریاتی انتہا پسندی کا شکارنہیں ہے....وہ ایسے موضوعات اورشخصیات پرقلم اٹھاتے ہیں جوذہنی طور پران کے قریب ہوں۔کیوں کہ وہ شخصیت کے وسیلے سے صاحب کمال کےفن تک رسائی حاصل کرتے ہیں......شخصیات پر لکھے گئے ان کے تاثراتی مضامین قاری کے ذہن و دل پراپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔‘‘(معانی ومطالب۔ص:8)

’تفہیم وترسیل‘میں فاضل مصنف کے بیس مضامین شامل ہیں مگرتمام مضامین اپنی ماہیت میں تنقیدی نوعیت کےنہیں ہیں۔ان میں بعض خاکہ نمامضامین ہیں،بعض تبصرے(افسانہ/کتاب/رسالہ)اورکچھ تنقیدی مطالعات پرمشتمل ہیں۔ان میں سے زیادہ تر مضامین سیمینار میں پڑھے گئے ہیں اور بعض فرمائشی قسم کے ہیں۔اس لیے ان میں تنقید سے زیادہ تاثر اورتحسین کا انداز نمایاں ہے۔تاہم فاروق بخشی نے زیرمطالعہ شاعرواد یب اور کتاب وصاحب کتاب کا معقولیت سےتعارف کرانے اورادب میں اس کی اہمیت واضح کرنے کی امکان بھرکوشش کی ہے مثلاً’’علامہ شبلی نعمانی اپنے اردوکلام کے آئینے میں‘‘نامی مضمون میں مصنف نےشبلی کی عبقری شخصیت وتصانیف کا تعارف کراتے ہوئے ان کی غزل گوئی اورنظم نگاری پرسیر حاصل گفتگوکی ہے۔شبلی کی غزل گوئی کےتعلق سے وہ لکھتے ہیں:

درج بالاغزلیات کےاشعار میں وہی نازک خیالی اورلطافت بیان موجود ہے جواس عہد کی غزل کاطرہ امتیازتھی جسے داغ اسکول کی خصوصیات میں شمارکیا جاسکتا ہے

شبلی کی غزلیں بڑی حد تک روایتی انداز لیے ہوئے ہیں مگران کی نظمیہ شاعری وقیع ہے۔ان کی نظموں کی اہمیت ومعنویت اجاگر کرتے ہوئے فاروق بخشی نے درست لکھا ہے کہ:''شبلی کے سیاسی تصور کی غمازی کرتی ہوئی ان کی شاعری ہندستان کی روح سے بہت قریب ہے۔انھیں قومیت کا احساس تھا۔جمہوریت کے درخشندہ مستقبل کا اندازہ تھا۔تعصب وتنگ نظری سے ان کا دامن پاک تھا،عقیدے کی پختگی اور نظریے پر مکمل اعتماد نے ان کے اندر ایک عجیب سی ثابت قدمی کا احساس بہت گہرائی تک بھر دیا۔''(تفہیم وترسیل۔ص:64)

معروف مزاح نگار اور خاکہ نگار مجتبیٰ حسین کو فاروق بخشی بھارت کا سب سے بڑا مزاح نگار مانتے ہیں اور انھیں مشتاق احمد یوسفی پر ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں جس مزاح نگار کو اس (مشتاق احمد یوسفی) کے ہم پلہ کہا جاسکتا ہے وہ مجتبیٰ حسین ہیں۔ بلکہ ہماری حقیر رائے میں اگر مجتبیٰ حسین کے فن کا تجزیہ پچاس سال کے خالص تناظر میں کیا جائے تو مجتبیٰ حسین کی تحریریں مشتاق احمد یوسفی سے بھی آگے نظر آتی ہیں(تفہیم وترسیل۔ص:34)

''میرے نزدیک اردو نثر کی طنزیہ اور مزاحیہ تاریخ میں مجتبیٰ حسین کی حیثیت ایک ہمہ جہت فن کار کی سی ہے۔ان کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کا دائرہ زندگی کے تمام تر منظرنامے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''(ص:37)

> میرے نزدیک اردو نثر کی طنزیہ اور مزاحیہ تاریخ میں مجتبیٰ حسین کی حیثیت ایک ہمہ جہت فن کار کی سی ہے ان کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں کا دائرہ زندگی کے تمام تر منظرنامے کا احاطہ کئے ہوئے ہے(ص:37)

''معاصر اردو ادب میں ہندستانی عناصر''نامی مضمون میں فاضل مصنف نے ادب وسماج اور ادب اور سیاست کے باہمی ربط اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے متعلق اپنے ادبیانہ اور ناقدانہ تصورات کا اظہار کیا ہے مثلاً: وہ عہد حاضر میں سیاست کی بڑھتی ہوئی بالادستی اور زندگی کے ہر پہلو میں دخل اندازی پر فکرمندانہ طور پر لکھتے ہیں:

اسے ہماری بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ ادب، کلچر، تاریخ اور زندگی میں قدروں کے حوالے فیصلے کرنے کی طاقت اب سیاست دانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، اور جس طرح کی سیاست سے ہمارا سامنا ہے اس میں اقدار کا حصول اور کسی حربے سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کا جنون انھیں ہر طرح کی تہذیبی اور اخلاقی گراوٹ کی طرف لے جا رہا ہے۔آج سیاست ان لوگوں کے دروازے کی لونڈی ہے جو معاشرے کو اپنے اقتدار کے حصول کی خاطر کسی بھی طرح کے جہنم میں جھونکنے کو تیار ہیں انہوں نے ملک کو ایسے اندھے غار میں دھکیل دیا ہے جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دور تک نظر نہیں آتا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہر اخلاقی پابندی سے آزاد سمجھ لیا ہے۔معاصر اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہر سچائی کو انہوں نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔تاریخ، فلسفہ، قانون، معاشرت، لسانیاتی نقطہ نظر، سب کے حوالے سے ان کی اپنی من گھڑنت تعبیریں ہیں۔اس لئے کہ جب سیاست ہر چیز کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے تو معاشرت کے اقدار و تصورات کا پست ہونا لازمی ہے۔ہماری موجودہ سیاست اور سیاسی رہ نما اس کی مثال ہیں (ص:97)

ترقی پسند فکر نے ہمیں ادب و سماج کی طرح ادب اور سیاست کے تعلق سے سنجیدگی سے سوچنے سمجھنے کا تصور دیا ہے۔ترقی پسند شاعری، اس کی روشن مثال ہے۔فاروق بخشی چوں کہ ترقی پسند تصورِ حیات کے قائل اور مؤید ہیں۔چنانچہ عصری، سماجی و سیاسی مسائل و معاملات میں وہ ادبا و شعرا کو علمی و قلمی کارکردگی پر آمادہ کرتے ہیں۔

فاروق بخشی کے نزدیک ہمارے حساس اور بیدار مغز شعرا کو اس پیمبری کے وقت میں شاعرانہ ہی نہیں، مجاہدانہ رول ادا کرنے کی بھی ضرورت ہے۔آج بھی کئی نئے ترقی پسند قلم کاروں کے ادب پاروں میں انقلابی و اجتہادی فکر و احساس کی ترجمانی دیکھی جا سکتی ہے۔چنانچہ ندا فاضلی کی شاعری (لفظوں کا پل) پر اظہار خیال کرتے ہوئے فاروق بخشی لکھتے ہیں:

ندا فرقہ وارانہ جنون کے جس ذاتی تجربے سے گزرے تھے۔کچھ عرصہ تک ان پر بھی اس کا تاثر قائم رہا لیکن بہت دیر تک وہ ذات کے نہاں خانوں میں قید نہیں رہے بلکہ انہوں نے اپنے مطالعے اور اس سے بھی زیادہ اپنے مشاہدے سے اس راز کو پالیا تھا کہ شاعری ایک مسلسل سماجی عمل ہے اور شاعر کو اپنے فرائض منصبی سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔اسی لئے میں انہیں ترقی پسندوں کے اس حلقے کا شاعر تصور کرتا ہوں جس نے ترقی پسندی کی توسیع میں نمایاں کردار ادا کیا اور نئی ترقی پسند کے لئے راستہ ہموار کیا کہ انہوں نے کسی نظریئے کا نقاب اوڑھے بغیر وسیع تر انسانی مفادات کو اپنی شاعری کا مرکز و محور بنایا (ص133)

دوہوں کے ذریعے انہوں نے اپنے تصورات کی ایک نئی دنیا آباد کی جس کی جڑیں ہماری اجتماعی فکراور لاشعور میں کئی صدیوں سے پیوست ہیں۔ندؔا فاضلی کی نظم بھی تقریباً انہی صفات سے متصف ہے۔بلکہ میرے نزدیک ندؔا فاضلی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے آزاد نظم کو عوامی سطح پر اس مقبولیت سے ہمکنار کیا جس تصور بھی ان کے معاصرین نہیں کر سکتے تھے(تفہیم وترسیل۔ص:134)

''احتجاج کی آخری آواز:راحتؔ اندوری''ایک خاکہ نما مضمون ہے۔اس میں مصنف موصوف نے شاعر مرحوم سے مشاعروں میں اپنی ملاقاتوں اور اندور میں اپنے دولت کدے پر کی گئی میزبانی کا ذکر کیا ہے،ساتھ ہی شاعر کے فکروفن پر بھی مدافعت آمیز بحث کی ہے۔انھیں اس بات کا شدید سے احساس ہے کہ ہماری تنقید نے راحتؔ اندوری کو مشاعرے کا شاعر کہہ کر نظر انداز کیا ہے اور یہ کسی بھی مقبولِ زمانہ شاعر کے ساتھ ناانصافی ہے۔فاروق بخشی نے راحت اندوری کی شاعری میں سماجی اور معاشرتی مذموم رویوں اور قباحتوں کی نشان دہی کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

راحتؔ نے اپنی زندگی کا مطالعہ بہت باریکی سے کیا ہے۔اسے انسانی نفسیات کی ان دیکھی دنیاوں کی پہنائیوں میں اترنے کا بڑا شوق ہے وہ انسانی مزاج اور شخصیت کی پر پیچ گلیوں سے گزرنے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔نئی زندگی کی مصلحت اندیشیوں سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔وقتی طور پر رشتوں کے بننے اور بگڑنے کے فلسفے کو بھی خوب سمجھتا ہے۔وہ محض ذات کے نہاں خانوں میں نہیں بھٹکتا بلکہ اپنے عہد کے نوجوانوں کو فعال اور متحرک دیکھنا چاہتا ہے(ص29)

راحتؔ اندوری نے گزشتہ چار دہائیوں میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بنائی ہے،وہ مشاعروں کے مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے تھے۔اپنے بلند آہنگ اور بے باک شعری اسلوب کی بدولت انھیں مشاعروں میں جو قبول عام حاصل ہوا۔وہ واقعتاً قابل رشک ہے۔یہ شعری لب ولہجہ چوں کہ ترقی پسندانہ بلند آہنگ طرزِ سخن سے کسی قدر مماثل ہے،چنانچہ قابل توجہ ہے۔بقول مصنف:

راحت اندوری کی شاعری میں ان کے طنزیہ لب ولہجے نے احتجاج کی شکل اختیار کرلی ہے۔اردو شاعری کی تاریخ گواہ ہے کہ اس زبان کے فن کاروں نے ہر جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔۔۔راحت کے یہاں ایسے بہت سے اشعار میری نظر سے گزرے جن میں ملک کے فساد زدہ شہروں کے مظلوم عوام کی بے بسی،ان کی مجبوریوں،محرومیوں اور نابرابری اور طبقاتی کشمکش کا اظہار کچھ اس حقیقی انداز میں ہوا ہے کہ بے جان اور گونگے الفاظ بھی بول پڑتے ہیں۔اردو ادب کا یہ پانچواں درویش اپنی شاعری کے وسیلے سے اپنے عہد کا قصہ بڑے سچے اور کھردرے لب ولہجہ میں سنارہا تھا ،وہ اپنے پیچھے احتجاجی لب ولہجہ کا وہ سرمایہ چھوڑ گیا ہے جو ہم میں سے بہت سوں کے لئے انمول ہے(ص:31-30)

جیسا کہ ذکر ہوا فاروق بخشی ترقی پسند تصور حیات سے متاثر رہے ہیں۔ان کے شعری افکار اور تنقیدی جائزات میں ادب اور انتقاد کا یہ صالح اور تعمیری طریق کار دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے، بایں ہمہ اپنے مطالعات میں وہ کہیں نظریاتی ادعائیت کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔انھوں نے بعض غیر ترقی پسند، جدیدیت پسند اور خالص کلاسیکی انداز سخن اپنانے والے ادبا و شعرا کے رشحات قلم کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔اس نوعیت کے مضامین میں: ''جدید غزل میں تخلیقی اظہار کی جنبش اور بشیر بدر''، ''چار بیت: رزم سے بزم تک''، ''راجستھان میں اُردو تنقید: ایک جائزہ''، ''ننھی کی نانی اور عصمت چغتائی: ایک تجزیہ''، ''اردو شعر و صحافت کی متاع گم گشتہ: پنڈت ہری چند اختر''، ''کشمکش کے آئینے میں: منصور عثمانی'' وغیرہم میں مصنف کا طریق مطالعہ بڑی حد تک فطری اور معروضی انداز لیے ہوئے ہے۔چند مثالوں سے ہمارے خیال کی توثیق ہو جائے گی:

پنڈت ہری چند اختر (1901 تا 1958) کی ادیبانہ اور صحافیانہ خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے فاروق بخشی لکھتے ہیں:

وہ کلاسیکی شاعری کے دلدادہ اور وارفتہ تھے۔شاعری کے فنی اصول، ضابطے، نکات، معاملات، اسالیب، اساس و شعریات کا انہیں بخوبی علم تھا وہ کسی بھی شعری فن پارے کی پرکھ ان کی روشنی میں کرتے ہیں۔۔۔ان کے اداریئے بیک وقت علمی، ادبی و شعری تنقید، سیاسی و سماجی حالات کے عکاس اور قوم پرستی و سامراج کی چیرہ دستیوں سے آگہی کا بیان ہوتے تھے

منصورؔ عثمانی کی شاعری (کشمکش) کا غزل کی تہذیبی اور شعری روایت کے تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے بخشی صاحب لکھتے ہیں:

غزل کی مزاج دانی اور تہذیب غزل کا شعور ان کی گھٹی میں پڑا ہے۔اسی تو انہوں نے دل کی باتوں کو بھی دل سے جوڑ لیا ہے تا کہ ان کی غزل کائنات کے دائرے میں آپ بیتی بھی ہو اور جگ بیتی بھی (ص:159)

بشیر بدؔر جدید غزل کے نمائندہ اور مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کے دیباچوں میں بزعم خود یہ بھی لکھا ہے کہ:

میری غزل، ناچیز غزل اردو غزل کے کئی سو سالہ سفر میں نیا موڑ ہے، میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن چکا ہے۔میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے عہد میں یعنی (2035) میں جو غزل رواں دواں ہے اس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوا ہے

فاروق بخشی چوں کہ بشیر بدر کے شاگرد ہیں چنانچہ استاد محترم کے تعلّی آمیز فرمودات کی دفاعی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بشیر بدر کی غزل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ وہ مکتبی قسم کی تنقید تھی جو بندھے ٹکے اصولوں کے تحت فن پاروں کی تفہیم کا وسیلہ بنتی تھی اور بشیر بدر کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ان کی غزل کی پذیرائی ادبی حلقوں میں اس طرح نہیں ہو پا

رہی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔۔۔لیکن ابتدا میں بشیر بدر کے شعری مزاج میں یہ تعلّی آمیز رویہ نہیں تھا۔ان کے مزاج کی عاجزی، انکساری اور تہذیبی رواداری ان کا حصہ تھی لیکن اردو تنقید کی ان دیکھی اور نقادوں کی ہٹ دھرمی نے انھیں ایسے راستے پر ڈال دیا جو انانیت کے بیان سے بھرا تھا(14)

بشیر بدر کا یہ بیان اور پیشین گوئیاں ان کی راہ کا روڑا بنی ہیں اور اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ ان کی غزل کو تنقید کا وہ ساتھ نہیں ملا جس کی وہ مستحق تھی۔لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں اس تعلّی آمیز رویئے کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔(تفہیم وترسیل۔ص:16)

بلاشبہ ہمارے کلاسیکی شعرا کے یہاں تعلّی اور خودستائی کی امثال دیکھنے کو ملتی ہیں اور اردو کے تین عظیم شعرا: میر انیسؔ، میر تقی میر اور غالب کے یہاں خاص کر تعلّی کا عنصر نمایاں ہے۔میرے خیال سے میر انیسؔ اور میر و غالب ایسے عظیم شعرا کو ایک حد تک تعلّی کا استحقاق حاصل ہے کہ وہ واقعتاً اردو کے عظیم شعرا میں شامل ہیں مگر بشیر بدر ہمارے عہد کے عظیم نہیں مقبول شاعر ہیں چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری کے انفراد و اجتہاد کے جو دعاوی کیے ہیں۔ان میں حقیقت کم خودستائی زیادہ ہے اور خودستائی کی بنیاد ہمیشہ کمزور ہوتی ہے۔مقام شکر ہے کہ فاروق بخشی صاحب کے یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔بشیر بدر کی طبیعت میں جس قدر خودستائی ہے، بخشی صاحب کے مزاج میں اُسی قدر عاجزی اور انکساری رچی بسی ہوئی ہے۔مثلاً: وہ لکھتے ہیں:

اس کتاب(تفہیم وترسیل) کو میں اپنے عزیز از جاں دوست پروفیسر ابن کنول کو معنون کر رہا ہوں جن کی شخصیت میں اسلاف کی سی وضع داری اور دل جوئی کی صفات حلول کر گئی ہیں، وہ ہمیشہ میرے ء لئے فکر مند رہے اور'اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا' کہ 178 صفحات کی کتاب لکھنے کے بعد اپنے 'حرف چند' کا اختتام اس بلیغ و معصومانہ جملے پر کرتے ہیں'اگر ان مضامین میں کوئی ایک جملہ بھی میرے کسی قاری کو پسند آیا تو میں اسے اپنی کامیابی سمجھوں گا۔

میرے خیال میں اس کتاب کے اچھے مضامین میں درجنوں پیراگراف اور سینکڑوں ادبی و تنقیدی جملے موجود ہیں جو مصنف کے Mature ادبی ذوق اور شگفتہ و پرکیف طرزِ بیان کے مظہر ہیں۔یہاں گفتگو چوں کہ بشیر بدر سے متعلق ہو رہی ہے لہٰذا اسی مضمون سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ان میں اسلوب کی شگفتگی اور خیال کی طرفگی و تازگی محسوس ہوتی ہے۔لکھتے ہیں:

(i)جدید غزل گو شعرا کی کہکشاں میں بشیر بدر اپنے زبان و بیان ،لفظیات ،تشبیہات ،استعارات اور پیکر تراشی نیز نئی زندگی سے وابستہ تمام تر تصورات کو انفرادیت کے ساتھ بیان کرنے کی بدولت ایک الگ اہمیت کی شعری شخصیت کے مالک ہیں بشیر بدر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو ایک مخصوص حلقے اور حدود سے باہر نکالنے میں وہ کردار ادا کیا ہے کہ ان کا تخلیقی کارنامہ غزل کی تاریخ کا ایک سنہری باب نظر آنے لگا ہے۔۔۔دراصل بشیر بدر کی غزل پہاڑوں کے اس حصار کو توڑ کر زندگی کے بہتے ہوئے دریا کے ساتھ اسی طرح رواں ہوئی ہے کہ سب نے اسے حیرت و استعجاب سے دیکھا ہے ۔اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے بشیر بدر کے تمام بڑ بولے پن کے باوجود ان کی غزل لاکھوں دلوں کا نغمہ بن گئی(ص:13-14)

(ii)میرا ایمان ہے کہ اچھی اور بڑی شاعری میں جذبے اور عقل کا توازن بھی ہوتا ہے اور فکر و احساس کی آمیزش بھی۔بشیر بدر کی غزل ان کا شان دار نمونہ ہے۔ان کے یہاں انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی ہے اور مقدس جذبوں کے اظہار کا سلیقہ بھی۔جمالیات کی روشنی بھی جو ان کے الفاظ کے گرد روشنی کا ایسا ہالہ بنا دیتی ہے کہ ان کے پڑھنے والے احساسات کی نئی اور ان دیکھی دنیاوں کے سفر پر نکل پڑتے ہیں

(iii)بشیر بدر جدید غزل کی تاریخ کا روشن باب ہیں انہوں نے غزل کی وہ زبان تخلیق کی ہے جو ہمارے عہد کے احساسات و جذبات کی نمائندہ ہے۔نیا سے نیا لفظ اور کوئی بھی تلازمہ ان کے یہاں شعری تجربہ اتنی آسانی سے بن جاتا ہے کہ ہمیں حیرت ہوتی ہے۔نئی تشبیہات، نئے استعارے،ان کی علامتیں ہمارے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔اس لئے جدید غزل کا ہر تذکرہ بشیر بدر کے بغیر ادھورا سمجھا جائے گا(ص:61)

'تفہیم و ترسیل' میں بیشتر مضامین شعری مطالعات پر مشتمل ہیں ۔مگر چند خاکوں کے علاوہ تین مضامین بالترتیب'' کیول دھیر اور ان کا افسانہ 'دہشت' تجزیے کی نظر سے''، ''ننھی کی نانی اور عصمت چغتائی :ایک تجزیہ' اور ''بساطِ نشاطِ دل اور انشائیہ نگاری''ایسے بھی ہیں جو افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے مطالعہ سے متعلق ہیں۔ان مضامین میں مصنف کا معروضی اندازِ نقد بروئے کار آیا ہے۔کہنا ہوگا کہ ایک شاعر نقاد نے انتہائی معقولیت اور جامعیت کے ساتھ کہانیوں اور انشائیوں کا جائزہ لیا ہے۔پنجاب کے دہشت گردانہ ماحول میں لکھی گئی ''دہشت'' کہانی کے نفس مضمون اور انداز پیش کش پر جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

کیول دھیر کی یہ کہانی پنجاب کے ان حالات کی وکاس ہے جب وہاں دہشت گردی کا بول بالا تھا۔ہندوؤں اور سکھوں

> کے درمیان منافرت اپنی ساری حدیں پار کر چکی تھی۔ کہانی کار نے بڑی چابکدستی اور فن کارانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے بظاہر ایک احساس، جسے بے یقینی یا عدم اعتماد سے تعبیر کیا جانا چاہئے، کے سہارے پوری کہانی کا تانا بانا بنا ہے، مگر اس کی بنت میں جس فن کارانہ کاری گری کا ثبوت دیا گیا ہے، اس نے کہانی کو غیر معمولی طور پر دلچسپ بنا دیا ہے کہانی کار کا بیانیہ اس قدر پر اثر ہے کہ قاری کو کہیں بھی بوریت اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کیفیت نے اس کہانی میں فلم سنیریو کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے، جیسے سفر کرتے ہوئے ہم منظر در منظر گزرتے ہیں اور ہر نیا منظر ذہن و دل میں ایک تجسس کی کیفیت چھوڑ جاتا ہے، ویسا ہی اس کہانی کو پڑھتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔۔۔ مجھے یہ کہانی اس لئے بھی پسند آئی کہ ہماری کہانی ایک بار پھر زمین پر اتر آئی ہے اور اس نے دھرتی کے باسیوں کے دکھ درد کو اپنے بیان میں سمیٹ لیا ہے(ص:55)

''ننھی کی نانی'' کہانی کا شمار عصمت چغتائی کی طبقۂ نسواں سے متعلق لکھی گئی اہم کہانیوں میں ہوتا ہے۔ بے نام ونسب طبقے سے تعلق رکھنے والے دونوں نسوانی کردار (ننھی اور اس کی نانی، بسم اللہ کی ماں) ہمارے معاشرے کے صدیوں پرانے مجبور و مظلوم کردار ہیں جن پر کئی افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھی ہیں۔ (مثلاً: کرشن چندر، منٹو) فاروق بخشی نے اس کہانی کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ ایسے مطالعات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد شاعری کے ساتھ ہی 'فکشن تنقید' کے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے۔ ''ننھی کی نانی'' کہانی اگرچہ عصمت چغتائی کی کم معروف کہانی ہے مگر اپنے ڈسکورس میں سماج کو آئینہ دکھانے والی عمدہ کاوش ہے۔ تجزیہ نگار کے مطابق:

> اس کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ وہ تمام تر خصوصیات جو عصمت کے فن کا خاصہ ہیں اس میں نمایاں ہو گئی ہیں۔ کہانی کا پلاٹ عورت کی بے قدری اور بے وقعتی کے اسی احساس سے لبریز ہے جو مرد اساس معاشرے کی خاص پہچان ہے اور عصمت نے اس کی نقاب کشائی کی۔ پوری کہانی کا پورا تانا بانا ننھی اور نانی کے اردگرد بنا ہے لیکن ننھی چند ابتدائی صفحات کے بعد غائب ہو جاتی ہے اور رہ جاتی ہے صرف نانی جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے(ص91)

> اس کہانی میں ذہن کئی سوالوں سے دوچار ہوتا ہے کہ آخر یہ سماج عورت کو ایک جان دار کب سمجھے گا، کب تک ننھی استحصال کا شکار ہوتی رہے گی اور کب تک نانی اپنی غربت کے بوجھ تلے دبی اوپر کا کام کرنے والی

نسل کی آبیاری کرتی رہے گی میرے نزدیک وصمت کی یہ کہانی سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش تھی جس میں وہ کامیاب ہوئی ہیں (ص:94)

'نشاطِ بساطِ دل' پروفیسر ابن کنول کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ موصوف شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے ہر دل عزیز استاد ہیں۔ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ وہ فکشن (داستان) کے معتبر ناقد بھی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں انھوں نے انشائیہ اور خاکہ نگاری کے ساتھ ہی سفر نامہ (چار کھونٹ) سے بھی دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ 'نشاطِ بساطِ دل' میں بیس (20) انشائیے شامل ہیں اور بقول فاروق بخشی:

''پروفیسر ابن کنول نے غیر افسانوی نثر میں خود کو تلاش کر لیا ہے۔''

گویا کہ خاکہ اور انشائیہ وہ نثری اصناف ہیں جن میں دوسروں کے ساتھ ساتھ خود مصنف کی ذات کے خد و خال بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ابن کنول کے انشائیے فطری طور پر ہمارے سماج و معاشرے میں موجود افراد کے ذہنی و جذباتی مسائل اور سماجی، سیاسی اور نفسیاتی عوارض و امور کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ شاملِ کتاب انشائیوں میں: ''میں ایک پروفیسر ہوں''، ''میں صحافی بننا چاہتا تھا''، ''علی گڑھ کا جغرافیہ''، ''کووڈ- 1 9''، ''لاک ڈاؤن''، ''ویبینار''، ''چوری کے مابعد جدید طریقے''، ''فیس بک سے 'وہاٹس ایپ تک'''، ''بہو کی تلاش'' وغیرہ انشائیے واقعتاً مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ہیئت و ماہیت میں تخیل کم، حقیقت زیادہ ہے۔ فاضل مبصر نے ان انشائیوں کے متعلق جامعیت کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> موضوعاتی بوقلمونی نے ان انشائیوں کو بے انتہا کارآمد اور ابن کنول کو عہد ساز انشائیہ نگار بنا دیا ہے۔ ان کے انشائیوں کی فضا بے انتہا خوشگوار ہوتی ہے۔ ابتداء تا آخر ان کا انشائیہ اپنے قاری پر ایک تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قنوطیت سے ان کے انشائیے کوسوں دور ہیں۔ ان کے انشائیوں کا بنیادی مقصد اپنے قارئین کو مسرت و انبساط کی فراہمی کرنا ہے، جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ خوش رہتے ہیں اور اپنے دل میں دوسروں کو خوش رکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ ان کا اظہار بیان فطری ہوتا ہے۔ جسے انشائیہ نگاری کا بنیادی وصف مانا گیا ہے۔۔ بلاشبہ ابن کنول کے یہ انشائیے اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ حاصل کریں گے (ص:115)

تفہیم و ترسیل کے مشمولات میں ''آہ عظیم بھائی''، ''ڈاکٹر خلیق انجم: کچھ یادیں کچھ باتیں''، ''پروفیسر فضل امام کی یاد میں'' اور 'پروفیسر ظفر الدین: یاد کے دریچے میں' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن میں 'خاکہ' کے خصائص ''بروئے کار آئے ہیں۔ ان تمام مرحومین سے مصنف کی دیرینہ شناسائی رہی اور آخری وقت تک تعلقات قائم رہے ہیں۔ لہٰذا برسوں کی آشنائی کے دوران جن

باتوں، ملاقاتوں اور واقعات نے مصنف کو متاثر کیا ان کا اظہار واعتراف ان تحریروں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ چوں کہ صاحب کتاب کو شروع سے ہی شوق سخن کے ساتھ ساتھ مشاعرے پڑھنے (ترنم سے) کا بھی شوق رہا ہے اس لیے ان خاکہ نما مضامین میں مشاعروں کی ملاقاتوں کا (تاریخ وار) اکثر ذکر ملتا ہے۔ اس اہتمام وانصرام سے خود خاکہ نگار کی رغبتوں اور طبعی میلانات پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ دوسری شخصیات کے ساتھ ہی ساتھ خود مضمون نگار کی شخصیت کے نقوش بھی اُبھرتے ہیں۔

''پروفیسر فضل امام کی یاد میں'' لکھے گئے خاکہ میں مصنف نے مرحوم سے اپنی دیرینہ شناسائی، ادبی جلوس آرائی، نظریاتی ہم آہنگی اور ان کے شخصی فضائل کا مفصل ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> عصر حاضر کے ممتاز ادیب، نقاد، دانش ور اور شاعر فضل امام رضوی بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔۔ وہ ایسی شخصیات میں شامل تھے جن کے بغیر بزم علم وادب عرصہ دراز تک سونی آئے گی۔ ان کی تحریر، ان کی تقریر اور ان کی بذلہ سنجی سے پر نکتہ سنجی ایسے اوصاف تھے جو ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت اور ان کے نپے تلے تیز طرار جملے اچھے اچھوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے تھے جو ان کے دوست بھی تھے دشمن بھی۔ مگر فضل امام ہمیشہ اپنی کج کلاہی کے بھرم کو قائم رکھتے تھے۔ ترقی پسند فکر کے حامل تھے۔۔ میری ان سے پہلی ملاقات 1979 کی جاتی ہوئی سردیوں کے دنوں میں جے پور کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ میں ان دنوں اجمیر میں تھا۔ فضل امام صاحب کو پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھتے ہوئے دیکھا بھی اور سنا بھی۔ آواز بڑی کڑک دار اور گھن گرج والی تھی۔ لہجہ کچھ پوربی انداز لئے ہوئے ضرور تھا، مگر ذہن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔۔ ہماری تو طالب علمی کا زمانہ تھا۔ فضل امام صاحب کا رویہ اپنے خوردوں کے ساتھ عام طور پر دوستانہ ہوا کرتا تھا۔۔۔ دسمبر 1980 کو میں دہلی منتقل ہو گیا تو وہ جب بھی دہلی آتے پہلے سے اپنی آمد سے مطلع کرتے اور میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوتا۔ دوسری اور یادگار ملاقات راشٹرپتی بھون کے مشاعرے میں ہوئی، گیانی ذیل سنگھ ان دنوں صدر جمہوریہ تھے۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے بولے 'اے بخشی یہاں بھی! دم ہے بھئی دم ہے' مشاعرے میں انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کوئی نظم سنائی۔ ان کا خطیبانہ انداز ذاکری کا تجربہ کل مجمع پر چھا گیا اس دن میں نے ترنم سے غزل پڑھی (ص:144-145)

> 18-19 اکتوبر 1986 کو جے پور میں راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ قمر رئیس صاحب کا حکم تھا کہ میں 17 اکتوبر کو جے پور پہنچ جاؤں تاکہ فضل امام صاحب اور فیروز صاحب کا ہاتھ بٹا سکوں۔ فیروز احمد صاحب کچھ متفکر تھے۔ استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ترقی پسندوں کی اس کانفرنس کے مخالفین نے شہر میں پمفلٹ بٹوائے ہیں اور یہ پرچار کیا جا رہا ہے کہ منکرین خدا اور اسلام مخالف لوگوں کی کانفرنس ہے۔ تھوڑی دیر میں

فضل امام صاحب بھی تشریف لے آئے دوران گفتگو انہوں نے تمام مسائل کو اپنے قہقہوں میں اڑا دیا۔بولتے وقت انہیں الفاظ دہرانے کی عادت تھی۔کہنے لگے 'ہم کربلائی ہیں، انقلاب کے جویا اور حسین کے پرستار ہیں۔کسی سے ڈرنے دبنے والے نہیں ہیں' ان کی دیکھ ریکھ میں دو روزہ یادگار کانفرنس منعقد ہوئی۔تمام سرمائے کا بندوبست بھی انہوں نے کیا تھا۔اس کانفرنس میں مذکورہ بالا اصحاب (قمر رئیس، عتیق اللہ، صادق، ابن کنول، ارتضیٰ کریم) وغیرہ کے علاوہ سردار جعفری جیسی عظیم المرتبت شخصیت بھی موجود تھی۔علی احمد فاطمی، پروفیسر محمود الحسن بھی تشریف لائے تھے۔کانفرنس کے تمام شرکاء کی ضیافت کا اہتمام انعام الحق صاحب کی کوٹھی پر ہوا تھا (ص:147)

اس طرح کی اور بھی ادبی ملاقاتوں کا ذکر خاکہ نگار نے کیا ہے۔فضل امام صاحب تقریباً 18برس (شعبۂ اردو راجستھان یونی ورسٹی) جے پور میں اپنی خدمات انجام دینے کے بعد 1986 کے آخر میں الہ آباد یونی ورسٹی چلے گئے۔ وہاں پہلے ریڈر اور بعد کو پروفیسر بنے۔ریٹائر ہو کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔13 اگست 2020 کو دار فانی سے رخصت ہوئے۔ڈاکٹر فضل امام واقعی شعبۂ اردو میں سب سے قابل اور ہر دل عزیز استاد رہے۔وہ یونی ورسٹی کیمپس کی طرح سے شہر کے ادبی حلقوں اور ہر فرقے (شیعہ۔سنی.....) میں یکساں طور پر مانوس و مقبول تھے۔وہ یقیناً طلبا کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور سنوارنے والے استاد تھے۔ان کے جانے کے بعد شعبہ ایک ہمدرد استاد، دیدہ ور ادیب اور نگراں کار (Supervisor) سے محروم ہو گیا۔

ع۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

''احتجاج کی آخری آواز: راحت اندوری'' نامی مضمون میں بھی 'خاکہ' کے عناصر ملتے ہیں۔راحت اندوری سے اپنی چند ملاقاتوں، ان کی ملن ساری، مہمان نوازی، خوش اخلاقی اور انکساری کا تذکرہ کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے:

> راحت اندوری کی شعری شخصیت کا دائرہ نصف صدی پر محیط ہے۔ان سے پہلی ملاقات 1974 میں میرٹھ میں یاد کوثر کے مشاعرے میں ہوئی تھی۔راحت جو عمر میں ہم سے تھوڑے سے سینئر تھے ایسے گھلے ملے کہ پچھلے پینتالیس برس میں یہ تعلق پختہ تر ہوتا گیا۔میں جہاں جہاں بھی رہا اور مشاعرہ میرے ہاتھ میں رہا ان کا نام میری فہرست میں سرفہرست ہوتا ان کی مقبولیت کے باعث ہر چھوٹے بڑے شہر میں ان کے مداحوں کا ایک حلقہ بن جاتا تھا اور ہر شخص انہیں اپنے سے قریب سمجھنے لگتا تھا۔میرا ان کا سب سے زیادہ تعلق کوٹہ میں رہا

مجھے دو مرتبہ ان کا مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ایک بار اندور گیا جن کے یہاں قیام پذیر تھا انہوں نے فون کر کے بتایا کہ فاروق بخشی آئے ہوئے ہیں اور ملاقات کے لئے آنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا کہ انتظار کیجئے اور تھوڑی دیر بعد وہ آ گئے

اور گھنٹوں باتیں ہوئیں اور پھر پرانے اندور کی مشہور تفریح گاہ 'راج باڑہ' میں جی بھر کے ضیافت کی۔دوسری مرتبہ عزیز اندوری کی دعوت پر گیا تھا۔۔ان دنوں وہ سری نگر کالونی میں اپنے مکان کی تعمیر میں مصروف تھے۔ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے اور بڑے خلوص سے تواضع کی۔ بھابھی کو پتہ تھا کہ ان کی بہن کوٹہ میں ہماری پڑوسن ہیں اس لئے قدر و قیمت میں اضافہ ہوا انجم رہبرا بھی ان کی زندگی میں باقاعدہ شامل نہیں ہوئی تھیں۔۔۔وہ گزشتہ نصف صدی سے اردو شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور میں نے ان کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب وہ اپنے ترنم کے زور پر مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔زیادہ تر نقادوں نے انہیں مشاعرے کا شاعر قرار دے کر ان کے کمالات سے آنکھیں پھیرنے کی کوشش کی ہے۔میرے نزدیک یہ بات ادبی دیانت داری کے خلاف کہ کسی شاعر پر اظہار خیال سے صرف اس لئے گریز کیا جائے کہ وہ مشاعرے کا مقبول و معروف شاعر ہے(ص:26-25)

راجستھان میں دراصل فاروقؔ بخشی اور عشرتؔ دھول پوری (جے پور) راحتؔ اندوری کے خاص دوستوں میں رہے ہیں۔ عشرتؔ دھول پوری عمر میں راحت صاحب سے تقریباً پندرہ برس بڑے تھے۔چنانچہ راحت صاحب کبھی ان کی بات نہیں ٹالتے تھے، وہ جب چاہتے اور جتنے میں چاہتے راحت اندوری کو کسی بھی مشاعرے میں آنے پر مجبور کر دیتے تھے۔بخشی صاحب خود ایک دوست دار اور رواداد مہمان نواز استاد ہیں اور ہر فرد میں اچھائی دیکھنے کے قائل ہیں وہ نظیرؔ اکبر آبادی کے طریق عمل:

''با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام'' کے قائل اور مؤید ہیں۔اس لیے کھانے والوں کے ساتھ ہی ''پینے والوں'' کے ساتھ بھی موصوف کے مراسم خوش گوار اور پائیدار بنے رہتے ہیں۔

''ڈاکٹر خلیق انجم : کچھ یادیں کچھ باتیں''،مضمون میں بھی 'خاکہ' کے خصائص موجود ہیں۔فاروق بخشی اپنی طالب علمی (میرٹھ) کے زمانے سے ہی خلیق انجم صاحب سے واقف ہو چکے تھے مگر میرٹھ سے دلّی منتقل ہونے اور پھر 1986 کو راجستھان آنے کے بعد بھی خلیق انجم صاحب سے بخشی صاحب کے اچھے مراسم رہے۔اس لمبے عرصے کے بعض ادبی واقعات اور تجربات و مشاہدات کا ذکر زیرِ نظر مضمون میں کیا گیا ہے۔اُردو کے اس روہیلہ مردِ مجاہد کی ادبی و علمی شخصیت کے تعارف میں بخشی صاحب لکھتے ہیں:

خلیق انجم صاحب ادیب تھے، محقق تھے، متوازن نقاد تھے، اچھے نثر نگار اور اس سے بھی اچھے خطیب اور مقرر انجمن ترقی اردو (ہند) کو انہوں نے ایک فعال ادارے کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔

'خلیق انجم صاحب ادیب تھے۔محقق تھے،متوازن نقاد تھے،اچھے نثر نگار اور اس سے بھی اچھے خطیب اور مقرر انجمن ترقی اردو (ہند) کو انھوں نے ایک فعال ادارے کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔انجمن کا آرگن 'ہماری زبان' کا شمار ان کے زمانے تک اپنی عظمتوں کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔اس میں شائع شدہ مضامین کو اعتبار کا درجہ حاصل تھا۔' (ص:157)

ڈاکٹر خلیق انجم کی افتادِ طبع اور ادب وادیب نوازی اور کریم النفسی کا بیان کرتے ہوئے خاکہ نگار رقم طراز ہے۔

'دسمبر 1980 میں میرٹھ سے دہلی منتقل ہوا تو ہم نوجوانوں سے جن میں ابن کنول تھے،ارتضیٰ کریم تھے،توقیر احمد خاں اور جلال انجم تھے،محمود فیاض اور چندر شیکھر بھی تھے۔ایک ادبی انجمن 'قلم زاد' کی بنیاد ڈالی۔قمر رئیس صاحب کی سرپرستی ہمیں حاصل تھی جلسے کہاں کیسے جائیں۔میں ارتضیٰ کریم اور ابن کنول خلیق انجم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انھوں نے بغیر کسی تکلف کے انجمن کا ہال ہمیں جلسوں کے لیے دینے کا وعدہ کرلیا اور وعدہ اس طرح نبھایا کہ جلسے کے بعد حاضرین جلسے کی ضیافت کا اہتمام بھی ان ہی کی جانب سے ہوتا تھا....گجرال کمیٹی کے زمانے کی جدوجہد ہو یا گجرال صاحب کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں سردار جعفری کمیٹی کی تگ و دو سب میں خلیق انجم کی حیثیت اردو کے ہراول دستے کے جاں باز کی سی تھی۔ان تمام کارروائیوں کے باوجود ان کا تحقیقی مشن جاری رہتا تھا۔اس میں ادبی تقریبات کے انتظام و انصرام سے لے کر قلم کا سفر بھی جاری رہتا۔'' (ص:154)

'یقیناً انھیں غصہ بھی آتا تھا سب دلّی والے جانتے ہی تھے کہ وہ گفتگو میں کیسے بے باک ہیں مگر ان کے دل میں بغض و کینہ نام کو بھی نہیں تھا۔خود اپنی جدوجہد اور محنت سے اس مقام تک پہنچے تھے۔اس کی تفصیل مطلوب ہو تو ڈاکٹر اسلم پرویز سے ملیے۔ان دونوں کی جگل جوڑی کل دہلی سے میں مشہور تھی۔یاری رشتہ داری میں بھی تبدیل ہوئی مگر محبت کا وہ بندھن جو دونوں نے اپنے ابتدائی ایام میں باندھا تھا وہ آخر دم تک قائم رہا۔'' (ص:154)

''دہلی میں غالب ہاؤسنگ سوسائٹی کا قیام بھی ان کے بڑے کارناموں میں شمار کیا جائے گا۔خلیق انجم صاحب،ساغر نظامی صاحب کے حلقۂ ارادت مندوں میں شامل تھے۔سرکاری حلقوں میں ان کا احترام تھا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی جیسا مشکل کام خلیق انجم صاحب کی تگ و دو کی بدولت اتنی آسانی سے ہوگیا۔ان کا خواب تھا کہ دہلی میں اردو کے شعرا اور ادیب ایک جگہ رہیں۔خواب تعبیر تک پہنچا بھی،مگر سب ادیب و شاعر تھے۔تعمیرات کی نزاکتوں اور باریکیوں سے ناواقف۔غالب ہاؤسنگ سوسائٹی ادیبوں کی ہوتے ہوئے بھی ادیبوں کی نہ ہوسکی۔'' (157)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے تربیت یافتہ شاگردوں (اردو زبان اور اردو والوں کے لیے جدوجہد کرنے والوں) میں خلیق انجم سرفہرست ہیں۔دلّی میں پروفیسر اور نقاد اور محقق تو اور بھی ہیں مگر اردو کے لیے جی توڑ محنت کرنے اور ہر طرح کی قربانی دینے والے کم ہیں۔خلیق انجم صاحب واقعی اردو کے مجاہدین میں شامل تھے۔راقم الحروف کو جے پور (سیمینار میں) اور دہلی (غالب انسٹی ٹیوٹ میں) میں مرحوم سے ملنے اور کچھ ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کے مواقع ملے ہیں۔وہ ایک دیدہ ور محقق ہونے کے باوجود خشک مزاج نہیں بلکہ،خوش مزاج اور شگفتہ گفتار واقع ہوئے تھے۔اکثر مذاقاً کہتے:''اللہ نے مجھے محقق تو بنایا مگر میری شکل محقق جیسی نہیں بنائی .....''

'تفہیم وترسیل' پروفیسر فاروق بخشی کے مضامین کی تیسری تصنیف ہے اس میں تنقیدی مضامین کے علاوہ خاکہ نما مضامین اور کچھ تبصرے اور تجزیے بھی شامل ہیں۔ان مضامین کے مباحث میں صلابت رائے کے ساتھ نتائج میں اعتماد کا احساس نمایاں ہے۔ان سے مصنف کے ذہنی میلانات وترجیحات کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ان مضامین میں تاثراتی اور نئی ترقی پسند تنقید کی عمدہ مثالیں بھی موجود ہیں تاہم تنقید کے تعلق سے ان کی دوسری تصنیف 'معانی ومطالب' (شہرِ سبز/اودے پور میں' تسوید کردہ) زیادہ وقیع ہے کہ اس میں چند ایک کے علاوہ بیشتر مضامین (ڈیڑھ درجن کے قریب) شعری تفہیم وتنقید پر مشتمل ہیں،البتہ زیر مطالعہ کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں شعری مطالعات کے ساتھ ہی ساتھ نثری مطالعات (فکشن تنقید) کے عمدہ نمونے موجود ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود جاذب توجہ ہیں۔علاوہ ازیں خاکہ نما مضامین میں مصنف کے تحت الشعور میں براجمان ایک ''خاکہ نگار'' سے بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے۔میرے خیال سے بخشی صاحب کو اپنے اشہبِ قلم کے ساتھ 'فکشن تنقید' اور 'خاکہ نگاری' کی گزرگاہوں پر گامزن ہونا چاہیے کہ بقولِ اقبال: ع: ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں'

اور پھر ''اداس لمحوں کے موسم'' کا شاعر بھی تو کچھ اسی طرح گویا ہے:

یہ مکاں ہے نہ وہ مکاں میرا میں ہواؤں کا ہم سفر فاروق

☆☆☆☆☆

ممتاز ذاکر حسین نقاد پروفیسر مولانا سید شبیہ الحسن نونہروی طاب ثراہ

پروفیسر انیس اشفاق

پروفیسر شبیہ الحسن ۲۰ / دسمبر ۱۹۲۸ء کو نونہرہ سے تعلق رکھنے والے لکھنو کے ایک معروف علمی خانوادے میں پیدا ہوئے ۔انہوں نے اپنی دینی تعلیم لکھنو کی ایک ممتاز دینی درس گاہ سلطان المدارس میں حاصل کی اور صدر الافاضل کی حیثیت سے فارغ ہوئے۔ پروفیسر شبیہ الحسن کے ذہن کی تعمیر و تشکیل میں ان کے والد مولانا ابن حسن نونہروی صاحب قبلہ نے اہم کردار ادا کیا جو خود بھی ایک جید عالم تھے۔مولانا ابن حسن ایک ممتاز خطیب تھے اور انہوں نے فن ذاکری کو اس کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا کر اس میدان میں ایک منفرد مقام حاصل کیا تھا۔ پروفیسر شبیہ الحسن کو خطابت اور ذاکری کا جوہر اپنے والد ماجد سے ورثے میں ملا تھا اور اپنے باپ کی طرح انہوں نے بھی اس فن میں کمال حاصل کیا۔دینی تعلیم کے حصول کے دوران پروفیسر شبیہ الحسن کو معروف ترین شخصیتوں کی ہم جلیسی حاصل تھی۔ان میں مولانا کلب عابد مرحوم، مولانا سبط محمد نقوی، مولانا غلام مرتضیٰ، کیفی اعظمی، راہی معصوم رضا، مولانا سید محمد صالح رضوی، مولانا رضوان حسین، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل اور مولانا راحت حسین جلالوی نیز حکیم کاظم بہاری وغیرہ شامل ہیں۔

دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر نے جدید تعلیم کے حصول کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور اس میدان میں بھی انہوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔انہوں نے ایم اے تک کا ہر امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بلکہ ہر امتحان میں نمائندہ پوزیشن حاصل کی۔انٹرمیجیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے علی گڑھ یونیورسٹی گئے جہاں ایک ذہین فعال اور سرگرم کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ یہاں انہوں نے اس زمانے کے اہم تقریری مقابلوں میں حصہ لیا اور اپنے کو ایک لائق اور خوش بیان مقرر کی حیثیت سے منوالیا۔ان کی خطابت کے جوہر سن کر علی گڑھ کے بزرگ اور ممتاز ہستیاں بھی ان کی معترف ہونے لگیں۔اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر انہیں اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین سے قربت حاصل کرنے کا موقع ملا جنہوں نے ہمیشہ انہیں بہت عزیز رکھا۔ پروفیسر شبیہ الحسن کو علی گڑھ یونیورسٹی یونین کے بلا مقابلہ سربراہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا اس یونین میں آج کی ممتاز سیاسی شخصیت شفیع قریشی جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ پروفیسر شبیہ الحسن یونیورسٹی کی میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے اور انہوں نے اس میگزین کا ایک عظیم الشان اکبرالہ آبادی نمبر بھی نکالا۔ پروفیسر شبیہ الحسن نے اس یونیورسٹی سے

پہلے نفسیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی پھر اردو میں قانون کا امتحان بھی انہوں نے اسی یونیورسٹی سے پاس کیا۔علی گڑھ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں انہیں پروفیسر رشید احمد صدیقی ، پروفیسر خورشید الاسلام کی شاگردی اور سابق وزیر تعلیم پروفیسر نور الحسن کی شفقت کا شرف حاصل ہوا

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد انہوں نے ایک مختصر سی مدت کے لئے دہلی کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کی ۔ ۱۹۵۶ء میں پروفیسر یوسف حسین موسوی کے دور صدارت میں لکھنو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ پر لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے ۔اپنی علمی لیاقت اور تدریس کے فن سے واقفیت کی بنا پر انہوں نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔اور طلبہ ان کے لکچر سننے کے منتظر رہنے لگے۔شعبۂ اردو میں اپنی ملازمت کے ابتدائی سالوں میں انہیں پروفیسر احتشام حسین کی مزید قربت حاصل ہوئی۔اس وقت شعبۂ اردو میں ہندوستان کی مایۂ ناز ہستیاں موجود تھیں ۔اپنے تنقیدی معتقدات کی بنا پر پروفیسر شبیہ الحسن خود کو احتشام حسین سے ہم آہنگ پانے لگے اور عمر کے فرق کے باوجود علمی اور ادبی معاملات میں دونوں ایک دوسرے سے کھل کر تبادلۂ خیال کرتے ۔

۱۹۷۵ء میں پروفیسر نور الحسن ہاشمی کے صدر شعبہ کے عہدے سے ریٹائر ہونے پر پروفیسر شبیہ الحسن اسی شعبے میں پروفیسر اور صدر کے عہدے پر مقرر ہوئے ۔ریٹائر ہونے سے قبل وہ آرٹس فیکلٹی کے ڈین بھی مقرر ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں ان دونوں عہدوں سے ایک ساتھ سبکدوش ہوئے ۔

پروفیسر سید شبیہ الحسن نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے کر دیا تھا ان کے مضامین ہندوستان کے معروف ادبی جریدوں میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کرنے لگے تھے اور جب ''تنقید وتحلیل'' کے عنوان سے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آیا تو ادبی دنیا میں اس مجموعے کی زبردست پذیرائی ہوئی ۔اس مجموعے کے اور مضامین 'غزل اور لاشعور' اور 'میر کے نہاں خانے' بے حد مقبول ہوئے اور اردو غزل اور شعر میر کی تفہیم میں ایک نئی معیار سازی کا موجب قرار پائے ۔اسی مجموعے سے پروفیسر شبیہ الحسن نے اردو تنقید میں خود کو نفسیاتی نقاد کی حیثیت سے مستحکم کیا اور انہیں اردو کے معدودے چند نفسیاتی نقادوں میں شمار کیا جانے لگا

پروفیسر شبیہ الحسن کا دوسرا اہم کارنامہ ناسخ پر ان کا وہ مقالہ ہے جس پر انہیں لکھنو یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ۔اس کتاب نے بعد کے ناسخ شناسوں کے لئے رہ نما کتاب کی حیثیت حاصل کر لی اور اس کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر ساہتیہ اکاڈمی نے اس کتاب کو بعد میں ایک مونوگراف کی صورت میں شایع کیا۔ان گراں قدر تصنیفات کے علاوہ انہوں نے مرزا مغل غافل کی زاد آخرت اور میر شیر علی افسوس کے نواسے حسین علی تالوف کے دیوان صد غزل کی ترتیب وتدوین بھی کی ۔ان دونوں کتابوں

کواردو تحقیق میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔زادآخرت پرانہیں ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی گئی۔اس کتاب کولکھنوکی نثر کا ابتدائی نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے کئی فکر انگیز مضامین بھی لکھے جنہوں نے نئے ادبی گوشوں کواجاگر کیااورادب کی اقتدارسازی میں اہم کردارادا کیا۔پروفیسر شبیہ الحسن کی لسانیات سے بھی گہرہ واقفیت تھی۔پروفیسر احتشام حسین کے شعبے سے چلے جانے کے بعد جب انہوں نے طلبہ کولسانیات پڑھاناشروع کی تو پڑھنے والوں کوان کی غیر معمولی واقفیت کا اندازہ ہوا۔

پروفیسر شبیہ الحسن نے بیرونی ممالک کے کئی علمی سفر بھی کئے۔۱۹۷۵ء میں وہ امریکہ،انگلستان،فرانس،کناڈا کے سفر پر گئے اور وہاں انہوں نے اہم ادبی موضوعات پر عالمانہ خطبے دیئے۔۱۹۸۰ء میں وہ ایک بار پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے جہاں انہوں نے نہ صرف اس کانفرنس کے اہم اجلاسوں کی صدارت کی بلکہ دوسرے ادبی اجتماعات میں بھی ممتاز شخصیت کی حیثیت سے شرکت کی۔۱۹۷۷ء میں انہیں یو۔جی۔سی کی جانب سے قومی لکچرر مقرر کیا گیا اس حیثیت سے انہوں نے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں خیال افروز خطبے دیئے۔

پروفیسر شبیہ الحسن ملک کے اہم اور نمائندہ اداروں سے بھی وابستہ رہے۔وہ اردو اکادمی کی تشکیل کے وقت سے لے کر اپنی سبکدوشی تک اس ادارے کی انتظامیہ کے بہ اعتبار عہدہ رکن رہے اوراپنے تدبر اور معاملہ فہمی کی بنا پر انہوں نے اس ادارے کے بہت سے مسائل بہ حسن وخوبی حل کرا دیئے۔اس ادارے کی رکنیت کے دوران ادارے کے سکریٹری صباح الدین عمر سے ان کی قابل رشک رفاقت مثالی نمونہ ہے۔صباح الدین مرحوم کے آخری سانس لینے تک یہ رفاقت پوری شدت کے ساتھ قائم رہی۔صباح الدین مرحوم کی وفات کے بعد پروفیسر شبیہ الحسن بجھ سے گئے تھےاوراکثر ان کے ذکر پر آبدیدہ ہوجایا کرتے تھے۔

پروفیسر شبیہ الحسن ساہتیہ اکادمی،گیان پیٹھ،اقبال سمان اور سرسوتی سمان وغیرہ ملک کے مقتدر اداروں کی انعامی کمیٹیوں سے بھی وابستہ تھےاس کے علاوہ وہ بعض بین الاقوامی اداروں کے مشیر بھی تھے۔یہ ادارے دینی اورادبی معاملات میں وقتاً فوقتاً ان سے مشورے حاصل کرتے رہتے تھے۔

۱۹۹۰ء میں پروفیسر شبیہ الحسن کواردو اکادمی نے مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں خصوصی انعام سے بھی نوازا۔

لکھنو یونیورسٹی سے سبک دوش ہونے کے بعد پروفیسر شبیہ الحسن لکھنو کے ایک قدیم اور ممتاز دینی ادارے مدرستہ الواعظین کی سربراہی کے فرائض انجام دے رہے تھےلیکن گرتی ہوئی صحت کی بنا پر انہوں نے اس ادارے کی مزید خدمت انجام دینے سے معذوری ظاہر کی تھی۔

پروفیسر شبیہ الحسن کے احباب میں ملک اور بیرون ملک کی معزز ہستیاں شامل ہیں۔ان میں پروفیسر ہری کرشن اوستھی ،پروفیسر رضوان علوی، پروفیسر محمود الٰہی ، پروفیسر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر رالف رسّل، پروفیسر ولی الحق انصاری، پروفیسر محمد حسن،

چودھری محمد علی زیدی عرف ننھن میاں ردولوی، راجہ صاحب پیر پور، جناب احمد مہدی اور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں پروفیسر رضوان علوی، پروفیسر محمود الٰہی اور پروفیسر ولی الحق انصاری سے ان کی زیادہ قربت تھی۔

پروفیسر شبیہ الحسن کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں کچھ نام یہ ہیں مولانا مرزا محمد اطہر صاحب قبل مرحوم ، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر انیس اشفاق، ، سابق گورنر سید سبط رضی ،ڈاکٹر صبیحہ انور، ڈاکٹر فاطمہ وصیہ جائسی وغیرہ۔ یہ شاگرد ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔

مرحوم کے پسماندگان میں ایک چھوٹے بھائی ضیاء الحسن مرحوم تھے، دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ان کے بڑے بیٹے یمین الحسن ہائی کورٹ لکھنو میں پریکٹس کرتے ہیں چھوٹے بیٹے سلیم الحسن لکھنو میں تجارت کر رہے ہیں۔ان کی بیٹی انجم فاطمہ پٹنہ یونیورسٹی میں کیمسٹری میں پروفیسر ہیں

(بہ شکریہ ماہنامہ اصلاح مسجد دیوان ناصر علی لکھنو)

☆☆☆☆☆

غالب کا تصور زندگی

پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی

ہرفن کار کی طرح غالب کے یہاں بھی ان کا تصور زندگی ان کے نظام فن کاری کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ان کے تصور زندگی ہی سے ان کے نظریہ عشق ومحبت اور فنکارانہ انفرادیت کا ظہور ہوتا ہے۔فن کاری کے تقاضوں کو یا عشق کے آداب کو اگر وہ کسی نئے ڈھنگ سے نباہنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا وہ مختلف تصور زندگی ہے جس کی مثال اردو کے دوسرے غزل گو شعراء کے یہاں نہیں ملتی۔اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے غزل گو شعراء کا اگر سطحی جائزہ بھی لیا جائے تو بڑی آسانی سے یہ اندازہ ممکن ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل کبھی روایتی اور کبھی انقلابی ڈھنگ سے فن کاروں کو متاثر کرتے رہے تھے۔فن کی دنیا میں اس طرح کی اثراندازی کوئی نئی بات نہیں ہے،لیکن اس عہد کے ہندوستان میں معاشی اور تہذیبی زندگی کا اتار چڑھاؤ اور تقدیر کے بدلتے ہوئے خطوط فن کاروں پر ردعمل کے ایک ایسے سلسلے کو پیدا کر رہے تھے جس میں مجموعی طور پر خاصا تنوع اور جاذب توجہ جدت تھی۔رد عمل کا یہ سلسلہ مختلف فن کاروں کے یہاں ان کی مخصوص صلاحیتوں،حدود،قریبی ذہنی اور سماجی ماحول کی وجہ سے ایک خاص طرح کی مزاجی تربیت کا آغاز کرتا تھا جو بڑھ کر ان کی فن کاری کو ایک سانچے میں ڈھال دیتی تھی۔حالات کی اسی مزاج پروری نے میر سوزؔ، قائمؔ خواجہ میر دردؔ،میرؔ،سوداؔ،مصحفیؔ،انشاؔء اور بہت سے دوسرے فن کاروں کو ایک خاص رنگ میں ڈبو دیا۔انہوں نے زندگی کے مخصوص قسم کے ردعمل سے ایک خاص طرح کا مزاج حاصل کیا جسے اپنی صلاحیتوں کے مطابق وہ شوخ وشنگ بناتے رہے۔اپنے فن کارانہ مزاج وشخصیت کو ایک خاص سمت پر لگا دینے کے باوجود اس عہد کے بعض فن کاروں نے جن میں میر خصوصیت سے نمایاں ہیں،زندگی کی بہت سی آفاقی قدوروں کو چھولیا،لیکن ان تمام شاعروں کے یہاں باوجود وسعت،عظمت،غیر معمولی گہرائی اور گرفت کے زندگی کے خاص خاص مسائل،ردوعمل اور زاویئے اس قدر چھا جاتے ہیں کہ وہ پورے تصور زندگی سے عبارت بن جاتے ہیں حالاں کہ حقیقتا وہ صرف زندگی کے اجزاء کی نمائندگی کرتے ہیں،مکمل زندگی اور اس کی تمام وسعتوں کی نہیں،ان تمام فن کاروں کے یہاں زندگی کسی نہ کسی جذبہ،رنگ اور اسلوب کی تابع ہو کر نمودار ہوتی ہے اور ان معنوں میں زندگی کی حیثیت ثانوی بن جاتی ہے اور اس پر عائد ہونے والے حالات کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے۔غالبؔ کے یہاں تصور زندگی کی نوعیت اس کے تقریبا برعکس ہے۔ان کے

یہاں بدلتے ہوئے حالات، ردعمل کی گردش، تغیر پذیر کیفیات خواہ وہ کتنے ہی سخت وتند کیوں نہ ہوں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور نفس زندگی کو ہر حال میں تقدم اور اولیت حاصل رہتی ہے۔ غالب کی شاعری میں بھی زندگی کی خاص خاص حالات اور کیفیات کا مخصوص رد عمل برابر ملتا ہے مگر ایسے سبھی موقعوں پر ان کی وہ ذہنی مزاحمت بیدار رہتی ہے جو ان کی فن کاری کے مزاج کو زندگی کے کسی مخصوص حالت میں ڈھل کر منجمد ہو جانے سے روکتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر رنگ کو دیکھتے ہیں مگر کسی رنگ میں ہمیشہ کے لئے رنگ نہیں جاتے ۔ وہ زندگی کے مختلف دائرے میں پھنس کر نہیں رہ جاتے وہ غم کو سہتے ہیں مگر پوری زندگی کو غم سے عبارت نہیں سمجھتے، وہ موقع ملنے پر عیش ونشاط کے حوصلے نکالتے ہیں مگر زندگی کی وسعت کو اس میں محدود نہیں سمجھتے، وہ گھر کی رونق کے قائل ہیں مگر رونق پر حدود نہیں عائد کرتے بلکہ رونق کی بنیاد ایک ایسا ہنگامہ سمجھتے ہیں جو کوئی بھی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ہنگامہ کے اندر چھپی ہوئی حرکت اور فعالیت زندگی ہے، اس میں نوحہ غم اور نغمۂ شادی کی کوئی قید نہیں ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق   نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

غالب اور دوسرے نمودار غزل گو شعراء کے یہاں تصور زندگی میں جو فرق دکھائی دیتا ہے اس کا خاص سبب یہ ہے کہ نفس زندگی اور غم زندگی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص کو زندگی گزارنے کا موقع جس طرح ملتا ہے، زندگی ہمہ تن اسی طرز سے عبارت بھی بن جائے۔ زندگی کی سچی معنویت کا شعور محض ذاتی حالات کے مطالعہ سے نہیں پیدا ہوتا ہے اس کے لئے دوسروں کی زندگی، پورے سماج کی زندگی بلکہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر جو ہر زندگی کے مشاہدہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بیش تر غزل گو شعراء نے 'کردن زندگی' کو دانستن زندگی بنا دیا۔ اگرچہ اس روش پر گرفت کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ زندگی کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی یہ بھی ایک فطری اور عملی راہ ہے لیکن اس موقع پر غالب کی ذہنی عظمت کا اعتراف ضروری ہے کہ زندگی کردن کے سلسلے میں دوسرے فن کاروں ہی کی طرح کے تجربات سے گزرنے کے باوجود 'دانستن زندگی' کے موقع پر انہوں نے اپنی راہ الگ نکال لی۔ ولی سے لے کر غالب بلکہ فانی تک زندگی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ مطالعہ کا انتہائی دلچسپ اور مفید موضوع ہے۔ اس پورے عہد میں 'زندگی کردن' کے مسائل شخصیت اور فن کاری پر حاوی رہے ہیں۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے مگر مگر چند منتخب مثالوں کا ذکر اس جگہ ضروری ہے:

(۱) زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے   دردؔ

(۲) جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے   اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے   میرؔ

(۳) معاش اہل چمن جائے رشک ہے سوداؔ   کہ زندگی کا انہوں نے مزا تمام لیا   سوداؔ

(۴) وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے مومنؔ

(۵) ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا فانیؔ

یہ سارے ردعمل زندگی کردن کی زحمتوں سے متعلق ہیں۔جس کو غم والم نے پناہ نہ دی اس نے زندگی کو سراپا محن سمجھا، جسے اہل چمن میں شامل ہونے کا موقع مل گیا اس نے وہیں قابل رشک زندگی کی نشان دہی کر دی۔ایسا نہیں ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں اس طرح کے واردات کو داخل ہونے کا موقع نہ ملا ہو۔وہ زندگی کردن اور اس کی کش مکش کے سلسلے میں دوسرے فن کاروں کے شریک غالب نہ سہی شریک حال ضرور ہیں۔زندگی کی الٹ پھیر نے دوسروں ہی کی طرح انھیں بھی متاثر کیا۔خاص طرح کے حالات و تجربات نے ان کے یہاں بھی انفرادی ردعمل پیدا کیا۔زندگی کی دشواریوں میں انھیں بھی مسلسل سراسیمہ رہنا پڑا۔جس کا اظہار ان کے مختصر سے دیوان کے کسی بھی صفحے سے ہوسکتا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

یہ اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار زندگی کی سختی، الجھن اور اسے گزارنے کی دقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس طرح کے اشعار میں انقلاب کے اوپر روایت کا اثر بالعموم حاوی رہتا ہے ان میں کبھی کبھی انفرادی جدت نظر آجاتی ہے مگر کوئی مخصوص نوعی جدت بالعموم نہیں دکھائی دیتی۔اس لئے کہ یہ زندگی گزارنے کی وادی ہے جو بڑے بڑے فن کاروں کے نقش قدم سے بھری پڑی ہے دراصل غالبؔ اور ان کے فلسفۂ زندگی کی انفرادیت کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے کہ جہاں وہ تعینات کو برطرف کر کے آگے بڑھتے ہیں اور زندگی کردن کو ایک ضمنی مسئلہ قرار دے کر خود زندگی اور اسے برقرار رکھنے والی قوتوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت جلد یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ زندگی کے گوں ناگوں حالات کا تعلق اس کے صفات، افعال سے ہے۔زندگی کے صفات ذات کچھ اور ہی ہیں۔واقعی زندگی تو فقط حرکت، سرعت اور افراد میں مختصر ہونے کے باوجود دائمی تسلسل و گردش سے عبارت ہے۔نشاط وغم، دل تنگی و خوش حالی، انبساط و گرفتاری زندگی کے متلاطم دریا کی فقط موجیں ہیں دریا کی اصلیت تو وہ حرکی قوت ہے جو ان موجوں کو مسلسل پیدا کرتی رہتی ہے۔اسی لئے غالبؔ موجوں کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ زندگی کے اس دریائے بیتابی پر ناز کرتے ہیں جسے اپنی شخصیت

کے اندر بڑی کاوش کے بعدانہوں نے اتارلیاتھا

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہےاک موج خوں وہ بھی

زندگی کے اس مخصوص تصور کی طرف جو ہمہ وقت تغیر،انقلاب،حرکت وگردش، ہنگامہ اور بیتابی کی دعوت دیتا ہےاور جوفرد،سماج اور کائنات کے متعلق نظریات کی بساط پلٹ دیتا ہے، غالب نے منفی اشاروں کے علاوہ غیر مبہم انداز میں بھی اظہار کیا ہے۔ان اشارات وتوضیحات کوغالبؔ کی مجموعی انقلاب آفرینی کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔

تری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی
مری محفل میں غالبؔ گردش افلاک باقی ہے

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد
غفلت آرائی یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

Editorial Board

Prof. S M Asad Ali Khursheed, Aligarh

Prof. Shaid Naukhez Azmi,Hyderabad

Dr. Mohd. Aqeel, Varanasi

Dr. Mohd. Ehteshamuddin, Aligarh

Dr. Mohd. Qamar Alam, Aligarh

M. Tauseef Khan Kaker,Aligarh

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Editor, quaterly DABEER, Kakori, Lucknow

Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad

Mutabbi Ali Khan, Daily Munsif, Hyderabad

Advisory Board

Prof. Masood Anwar Alavi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin, Lucknow

Prof. Azeez Bano, Hyderabad

P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad

Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.

Dr. S. Asmath Jahan, Hyderabad

Dr. M. A. Naeem, Hyderabad

M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.

Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai

Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad

ان اشعار سے زندگی کی برق خرامی اور سرعت وگردش کی واضح تصویر نمودار ہوتی ہے۔زندگی کی یہی رفتار اور تغیر آمادگی کائناتی مظاہر میں ایک دائمی اور مسلسل عمل کی علامت بن جاتی ہے جس کی وجہ سے تعمیر وتخریب کا ایک نامتناہی سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔اس پورے سلسلے میں نہ تعمیر کچھ بہت دل خوش کن چیز رہ کاتی ہے اور نہ تخریب میں کوئی آزردگی محسوس ہوتی ہے۔یہ سب چیزیں تیز رفتار زندگی کا نقش پا بن کر رہ جاتی ہیں۔غالبؔ کی نظر ہمیشہ زندگی کے دائمی عمل پر رہی اور اسی لئے تعمیر کے نقش ونگار کی درستگی پر انھیں کوئی خاص مسرت نہیں ہوتی تھی۔زندگی کے مخصوص تصور کی وجہ سے وہ سمجھتے تھے کہ تعمیری عمل سے تخریب کی قوتیں بھی پیدا ہوتی ہیں

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولٰی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

بعینہ یہی صورت حال اس وقت بھی باقی رہتی تھی جب کہ وہ اپنے کو تخریب وانتشار کی قوتوں کی گرفت میں پاتے تھے۔انھیں ایسے موقعوں پر اچھی طرح یقین رہتا تھا کہ اگر زندگی میں عملی تغیر جاری ہے اور اس کی گردش برقرار ہے تو کچھ نہ کچھ ہورہے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالبؔ کی پوری شاعری میں ہمیں جس زندگی سے سابقہ پڑتا ہے اس میں جمود اور بے عملی کی گنجائش نہیں ملتی ہے۔یہ ایک رواں دواں زندگی ہے جس میں پورا ماحول تیزی کے ساتھ گردش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے،ایک ایسی زندگی جو فرد سماج اور تصورات کو مسلسل حرکت میں رکھتی ہے،ایسی شاعری کو پروان چڑھاتی ہے جس میں ہر ساکن تقطیع سے گرجاتا ہے،جوفن کار کے جذبہ کو مسلسل فشار دیتی رہتی ہے،جوشاعر کو ایسے خواب خوش،سے بھی لطف اندوز نہیں ہونے دیتی جس میں مکمل سکون ہو،اس لئے یہ پرسکون خواب خوش ایک ایسا قرض ہے جس کی ادائیگی زندگی کے متحرک لمحوں میں ناممکن ہے

لوں دام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

اردوغزل میں حرکت اور تیز رفتار کا عنصر بہت کم دکھائی دیتا ہے۔بالعموم غزل کی دنیا میں زندگی دھیمی اور بوجھل رفتار سے چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے دوسری اہم مسرتیں بخشنے کے باوجود وہ پڑھنے والوں کے ذہن میں اس لئے خاص لطف ومسرت کو نہیں پیدا کر پاتی جو تیز رفتاری کے احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔غالبؔ کے علاوہ اردو کے دوسرے شعراء میں تیز رفتاری اور گردش پیہم کا احساس آتش کے یہاں برابر ملتا ہے۔وہ غزل گوشعراء میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ان کی غزلوں میں گردش ومستی کا ایک سماں دکھائی دیتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفتار کے معاملے میں وہ غالبؔ کو بہت پیچھے چھوڑ دیتے ہیں مگر غالب اور آتش کی رفتار اور تیزی کی نوعیت میں بڑا فرق ہے۔غالب کے یہاں متحرک زندگی کے متوازی متحرک جذبے اور اندیشے دوڑتے ہیں ۔جب دو متحرک چیزیں موازات میں چلیں گی تو ظاہر ہے کہ رفتار کا تفاوت گھٹ کر کم محسوس ہوگا۔آتش کے یہاں غیر متحرک زندگی

کے کرہ پر جذبہ اور خیال کی مستی گردش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی تیزی رفتار زیادہ آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے آتش کے یہاں زندگی متحرک نہیں ہے بلکہ تقریباً ماورائی اسباب کی وجہ سے ان میں خود ذوق گردش پیدا ہو گیا ہے۔ غالب کے یہاں ذوق گردش زندگی کے متحرک تصور کا پیدا کردہ ہے اس کے اسباب ماورائی نہیں ہیں بلکہ اسی عالم کون وفساد سے تعلق رکھتے ہیں دونوں ہی شاعر شاعری وفن کاری کے لئے ایک تیز رفتار سواری استعمال کرتے ہیں مگر ان سواریوں کی قوت متحرکہ علاحدہ علاحدہ ہے۔ آتش کا اسپ عمر، شوق منزل میں تیز رفتار ہے، وہ منزل پر پہونچ کر رک جائے گا۔ غالب کا رخش عمر نہ کوئی منزل رکھتا ہے اور نہ انجام۔ اس کے سوار بدلتے جائیں گے مگر اس کی رفتار قائم رہے گی آتش کا کہنا ہے

اڑتا ہے شوق راحت منزل میں اسپ عمر　　مہمیز کہتے ہیں گے کسے تازیانہ کیا

سمند عمر کو اللہ رے شوق آسائش　　عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

اس کے مقابل میں غالب کا بیان ایک مختلف زاویۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

منزل کے ایہام نے غالب کے رخش عمر کو جو تیز رفتار زندگی کا مادی استعارہ ہے ایک مسلسل اور دائمی عمل میں منتقل کر دیا ہے اور ایک ایسے سفر کی ترغیب دیتا ہے جس میں منزل کی نہیں فقط گردش کی لذت ہے

غالب کے یہاں اگر زندگی کے اس مخصوص تصور کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کی شاعری اور فن کاری کا کسی حد تک ایک نئے سیاق وسباق میں جائزہ لینا ممکن ہے۔ ان کی شخصیت کے اوصاف پر اس حرکی نقطۂ نظر سے نئی استدلالی بحث کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ان کے تصور زندگی کا لازمی منطقی نتیجہ ان کی وہ شخصیت ہے جو ان کی عام زندگی اور شاعری میں برابر اپنا اظہار کرتی رہتی ہے ان کی شخصیت میں بھی توقع کے مطابق بے تابی، بے چینی، سعیٔ مسلسل، اندیشہائے دور و دراز، ذوق سفر اور گرمی اندیشہ کا وہ جوہر ملتا ہے جو آسانی کے ساتھ زندگی کی برق خرامی کا حریف بن سکتا ہے ان کی شخصیت میں ودیعت ذوق گردش، بے آرامی اور سعیٔ پیہم اسی زندگی کی دی ہوئی برکتیں یا زحمتیں ہیں جسے بڑی جستجو کے بعد انہوں نے دریافت کیا تھا۔ حسب ذیل اشعار جن کی تعداد کو کئی گنا کیا جا سکتا ہے، غالبؔ کے تصور زندگی کی طرف معنی خیز اشارے کرتے ہیں

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　　اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

منت نہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال　　تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار　　اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش　　صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے　　زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

نہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا　　حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا　　کہ اس کے در پہ جو پہنچے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

غالب کے اسی مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے ان کے یہاں متحرک علامتیں () انبار در انبار ملتی ہیں ۔ان کے یہاں علامتیں پتھریلی نہیں ہیں بلکہ ان میں بھی زندگی کا بخشا ہوا نہ صرف تنفس بلکہ جولانی بھی ملتی ہے۔اردو شاعری میں وہ زندہ،متحرک اور بولتی ہوئی علامتوں کے سب سے بڑے خالق ہیں بنیادی طور پر شاعری میں استعمال ہونے والی علامتیں زندگی کی کسی بسیط یا مرکب صورت حال کی نمائندگی کرتی ہیں اسی لئے شاعر کے یہاں علامتوں کا استعمال اور ان کی نوعیت اس کے تصور زندگی کی مانی ہوئی نمائندہ ہوتی ہیں ۔جامد زندگی کی علامتیں بنیادی طور پر جامد ہوتی ہیں خواہ انہیں فن کاری کے آکسیجن سے کتنا ہی زندہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے ۔متحرک اور نامیاتی زندگی کی علامتیں زندگی کی فطری شادابی سے معمور رہتی ہیں خواہ ان سے غیر نامیاتی مظاہر کی نمائندگی کا کام کیوں نہ لیا جائے ۔غالب کی بیشتر علامتیں کسی مصنوعی عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے فطری حیاتیاتی ترکیب کی وجہ سے اپنے منصب اور کارکردگی کی تکمیل کرتی ہیں ۔ان کی علامتیں نظر فریب کٹھ پتلیاں نہیں ہیں بلکہ کائناتی کردار اور باخبر فنی گائڈ ہیں جو مطالعہ کرنے والوں اور فن کار کے پیش کردہ مسائل زندگی کے درمیان اچھے رابطے کا کام دیتی ہیں اور بالآخر اس میخانہ نیرنگ تک پہنچا دیتے ہیں جہاں جوش،گردش،اشاروں، چشمک،اندیشوں،شوق فضول اور جرأت رندانہ کے زندگی سے بھرپور ہنگامے برپا رہتے ہیں

ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے　　گردش مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے　　جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

دیکھ کر تجھ کو چمن، بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے
یاں عرصۂ تپیدن بسمل نہیں رہا

اے آبلہ کرم کر یاں رنجہ اک قدم کر
اے نور چشم وحشت اے یادگار صحرا

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

ان کے تصور زندگی نے نہ صرف یہ کہ ان کی فن کاری کے اندر ایک مخصوص تڑپ پیدا کی بلکہ ہجر و وصال و عشق محبوب کے روایتی اور منجمد تصور میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ خود ان کی شخصیت شوق فضول اور جرأت رندانہ سے معمور ہے۔ ایسی صورت میں محبوب بھی ستم ظریف اور ہنگامہ آرا ہونا چاہئے اس لئے کہ خود ان کی طرح وہ بھی زندگی کے حرکی تصور کا آفریدہ ہے۔ ایسے محبوب کے سلسلے میں ہجر و وصال کا مفہون بھی یقیناً بدل جائے گا۔ اسی لئے غالب کے یہاں وصل ایک فکر مسلسل کا نام ہے اور ہجر عالم تمکین وضبط کے جمود کا نام ہے

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہئے

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہئے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہئے

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصت کار و بار شوق کسے
ذوق نظارۂ جمال کہاں

غالبؔ کے ذہن میں اگر ہجر و وصال کا وہی روایتی تصور ہوتا تو وہ اس کے لئے ذوق نظارۂ جمال بھی پیدا کر لیتے اور کاروبار شوق کی فرصت بھی نکال لیتے۔ ان اشعار میں وہ غزل گوئی کے ان لوازم عشق کی طرف پر حقارت جملے پھینک رہے ہیں جنہیں مسلسل غزل میں قابل فخر سرمایہ کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اسی لئے وہ غزل کے روایتی محبوب سے اپنی لاپرواہی اور بے نیازی ظاہر کرنے میں

کبھی جھجھکتے نہیں ہیں

عالم غبار وحشت مجنوں ہے سر بسر　　کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر　　فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

غالبؔ کے یہاں وصل کا وہ مفہوم جس پر ان کے تصور زندگی کی پوری چھاپ دکھائی دیتی ہے اور جو غزل کے رائج آداب اور منضبط رسم وقانون کے برخلاف ہے ان کے پورے تصور عشق اور کاروبار محبت کو سمجھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔اس مفہون کو انہوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کر دیا ہے۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا نام ہے وصال　　کہ گر نہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

خواہش کی معمولی ترغیبات اور غزل کی روایت نباہنے میں انہوں نے اوپری دل سے جو کچھ کہہ ڈالا ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ،زندگی ہی ان کے عشق ومحبت کا محور ہے،زندگی ہی ان کی محبوب بھی ہے اوران کی رقیب بھی۔زندگی ہی ان ان کے لئے دوزخ بھی ہے اور جنت بھی ،چمن بھی ہے اور زندان بھی۔وہ ہر حال میں زندگی کے پرستار ہیں خواہ ان کے لئے سازگار ہو یا ناساز۔ان کے نظام فکر میں سب سے ہمہ گیر چیز آماجگاہ تغیرات میں مسلسل سفر کرنے والی زندگی ہے۔اس زندگی سے وہ الفت ومحبت رکھتے ہیں۔ان کی فن کاری اسی زندگی کا ہم سفر بننے کا دوسرا نام ہے۔جذبۂ عشق بھی ان کے یہاں زندگی پر حاوی نہیں ہے بلکہ زندگی کا تابع ہے یہی نقطۂ نظر انھیں اردو کے دوسرے غزل گوشعراء سے بڑی حد تک مختلف بناتا ہے۔اردو کے بیشتر پرعظمت شعراء کے یہاں عشق زندگی اور کائنات کا محرک بن کر نمودار ہوتا ہے۔وہ محض زندگی کے جذباتی عمل کو حرکت میں نہیں لاتا بلکہ کائنات کے طبیعاتی عمل میں بھی فیصلہ کن قوت کی حیثیت سے شریک رہتا ہے۔غالبؔ نے عشق کو یہ روایتی منصب کبھی نہیں بخشا۔ان کے نزدیک اس کی حیثیت زیست کا مزا بڑھانے والی ایک قوت سے زیادہ نہیں ہے عشق چاہے دوا ہو یا خود درد بے دوا ہو وہ زندگی کی فرع ہے زندگی کا حاکم نہیں ہے۔وہ زندگی کے لئے خواہ کتنا ہی ضروری ہومگر اہمیت کے اعتبار سے زندگی کا تابع ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں　　طاقت بقدر لذت آزاد بھی نہیں

یہی سبب ہے کہ عشق اپنی شدت اور وسعت کے باوجود انھیں الفت ہستی سے کبھی غافل نہیں کر سکا۔وہ عاشق ہونے کے باوجود اپنے وجود کو بکھرنے نہیں دیتے وہ سراپا رہن عشق ہونے کے بعد بھی الفت ہستی کو ناگزیر سمجھتے ہیں

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

وہ اپنے وجود کی بنیاد عشق والفت کے جذبے کو نہیں بلکہ اسی زندگی کو قرار دیتے ہیں جو مسلسل بے تابیوں، گردشوں اور تغیرات کو مہمیز کرتی رہتی ہیں، عشق اس زندگی کا ایک پرتو، ایک کارکن اور رفیق ہے۔ وہ زندگی کا بانی نہیں ہے اور اسی لئے خود غالبؔ کا بھی بانی نہیں، غالبؔ کیا ہیں اور ان کی بنا کاہے پر ہے اسے غالب کے تصور زندگی کی مدد سے خود ہی سمجھ لینا ممکن تھا مگر انہوں نے رفع اشتباہ کے لئے خود ہی واضح کر دیا ہے۔

گرد باد رہ بے تابی ہوں صر صر شوق ہے بانی میری

صرصر شوق حرکی تصور زندگی کا دوسرا نام ہے اس آب وہوا میں پرورش پا کر نمودار ہونے والا فن کار غالبؔ کی طرح انقلاب، تغیر اور تسلسل عمل کی پیمبری کا حق اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔

جس تصور زندگی کی مدد سے غالبؔ نے اپنی شخصیت کی تربیت کی ہے اور جس پر اپنے فکر وفن اور اس کے مختلف عناصر کی بنیاد رکھی ہے وہ عہد جدید تک پہنچتے پہنچتے کافی بالیدہ ہو چکا ہے۔ اردو شعراء کی موجودہ نسل اس تصور کو بغیر خاص طرح کے ذہنی تحفظات کے نہ صرف قبول کر چکی ہے بلکہ فن کی آب یاری میں اس سے کام بھی لے رہی ہے۔ اقبالؔ اور جوشؔ بھی اسی تصور زندگی کے مختلف زاویوں کے علم بردار ہیں۔ اسی بناء پر یہ کہنا ممکن ہے کہ عہد جدید کے فن کے بنیادی تصورات کا سلسلہ بغیر کسی زحمت کے غالبؔ سے ملتا ہے۔ غالبؔ اپنے ماضی اسے اتنا مربوط نہیں جتنا ان کا مستقبل اور اس کے فن کار، ان سے مربوط ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا کسی عجیب وغریب دعوی کے مرادف نہیں ہوگا کہ غالبؔ نہ صرف اپنے عہد کے پرشکوہ شاعر تھے بلکہ اس عہد فن کاری کے بانی بھی تھے جس سے موجودہ نسل کے شاعر ونقاد گذر رہے ہیں۔

(مطبوعہ نیا دور غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء)

☆☆☆☆☆

اردو غزل کا سماجی کردار

ڈاکٹر تسلیم

شعبۂ اردو و فارسی

راجستھان یونیورسٹی جے پور

زبان ایک سماجی عمل ہے اس عمل کا اظہار جن صورتوں میں ہوتا ہے اس کی ایک لطیف ترین شکل ادب بھی ہے، ادب کی ہی ایک صورت شاعری ہے اور جہاں تک ہماری اردو شاعری کا سوال ہے، غزل نے ایک صنف سخن کی حیثیت سے شہرت اور مقبولیت پائی ہے اس کی فنی خصوصیات سے قطع نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل ہمیشہ اور ہر دور میں زندگی اور سماج سے وابستہ اقدار کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتی رہی ہے، بس فرق اس رویہ اور مزاج کا ہے جو عصری تناظر میں قاری کی فہم و فراست کا امتحان لیتا ہے مثلاً خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

یا جب میر تقی میرؔ کہتے ہیں:

دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار — میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے

دردؔ اور میرؔ کے مذکورہ بالا دونوں اشعار جس دور کے سماجی یا پھر سیاسی جبر کے آئینہ دار ہیں، ان کی وضاحت سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غزل کے ان دو اشعار میں انیسویں صدی کے پورے سیاسی اور سماجی نشیب و فراز کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اردو غزل نے اس نشیب و فراز کو جس طرح اپنے دامن میں جگہ دی ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری غزل کا سماجی کردار بے حد اہم اور معنی خیز رہا ہے، یہ تو ممکن ہے کہ نشیب و فراز کا یہ انداز انیسویں صدی میں یکساں نہ ہو لیکن بیسویں صدی میں اردو غزل نے اپنے ارتقائی سفر میں ہر اس سماجی قدر کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے جس نے اجتماعی زندگی کے گہرے نقوش چھوڑے، اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہماری شعری و ادبی روایت میں یہ سلسلہ علی گڑھ تحریک کی منظّم کوششوں اور اس کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک کے بنیاد گزاروں کے ان افکار و نظریات کا نتیجہ ہے جنہوں نے ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے زندگی یا ادب برائے سماج کا نعرہ بلند کیا

بلا شبہ حالیؔ، آزادؔ اور شبلی نے مصلحانہ انداز اختیار کیا مگر ان کے بعد چکبستؔ، اقبالؔ، فراقؔ، جوشؔ اور فیضؔ کے علاوہ جذبیؔ، کیفی اعظمی، سردار جعفری اور مجروحؔ تک آتے آتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو غزل کا موضوعاتی دائرہ وسیع ہو چکا ہے اور اس کے اندازِ نہج میں بھی تبدیلی آ چکی ہے، یہی نہیں عشق و محبت کے علاوہ تصوف کے جن موضوعات سے عموما اردو غزل کا دامن بھرا رہتا تھا اس میں بھی تغیر واقع ہو چکا ہے مثلا انسان، خدا، بہشت، جہنم یا فلک و تقدیر کے جن موضوعات پر غزل گو شعراء نے اکثر اظہار خیال کیا تھا اور جن کی وجہ سے قاری متأثر ہوتا تھا۔ اول تو انیسویں صدی کے بعد شعراء کی آزادہ روی کے باعث ان میں کمی آئی اور دوم بیسویں صدی کے مختلف سیاسی و فلسفیانہ نظریات نے ذہن و فکر کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سے سماج میں نیا پن، وسعت اور روایت سے انحراف کی جو روش پیدا ہوئی اس نے نہ صرف غزل بلکہ پوری اردو شاعری کو نئے معنی سے آشنا کیا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہر سماجی یا سیاسی واقعہ یا واقعات شاعری یا غزل کا موضوع نہ بنے ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ غزل نے اپنے علامتی انداز و اسلوب کے سہارے ان سماجی تبدیلیوں کو جس طرح اپنے اندر جذب کیا وہ حد درجہ معنی خیز ہے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے حالیؔ

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی — لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل حالیؔ

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے چکبستؔ

مجھے اسیر کرو یا مری زباں کاٹو

ذیل کے اشعار بھی بدلتے ہوئے سماجی اور سیاسی مسائل کے ترجمان ہیں:

اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے فراقؔ

چمن پہ غارت گل چیں سے جانے کیا گزری — قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے فیضؔ

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی — چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا شادؔ عارفی

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ — یہاں جو حادثے ہو گئے ہیں ناصرؔ کاظمی

نکلے تھے حسین ابن علی رات ادھر سے — ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے شہریارؔ

مذکورہ بالا اشعار سماج میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کو آئینہ دکھاتے ہیں،ان سے تاریخ کی عدم موجودگی میں بھی واقعات کی حقیقت تک رسائی ہوتی ہے۔کم ازکم اتنی بات تو مذکورہ بالا اشعار کے حوالے سے بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ اب اردوغزل کا دائرہ بے انتہا وسیع ہو چکا ہےاور یہ حسن وعشق کے موضوعات ومطالب کے بیان سے اتنی دور آچکی ہے کہ جب ہم پلٹ کر اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری غزل محض عشقیہ جذبات واحساسات کی ترجمان نہیں بلکہ انسانی سماج اور اس میں رونما ہونے والے مختلف حالات وواقعات بھی غزل کے دائرے میں ہیں۔

☆☆☆☆☆

موازنۂ انیس ودبیر پر ناقدین کے نظریات

ٹیپو سلطان
شعبۂ اردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی جے پور

موازنہ انیس و دبیر پر ناقدین ادب کی آراء پیش کرنے سے قبل یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ شبلی نعمانی کے حالات زندگی کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جائے۔ جب ہم اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی ایک مورخ، سوانح نگار، شاعر، انشاء پرداز اور نقاد کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

> شبلی پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ وہ انشاء پرداز تھے، اگر انشاء پرداز نہ ہوتے تو مصور ہوتے ان کا علم، ان کی بصیرت ان کی پرواز فرشتوں سے لاگ نہیں کھاتی۔ یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ شبلی حسن خیال کے بھی قائل تھے اور حسن عمل کے بھی (۱)

مولانا کا نام محمد شبلی تھا امام ابوحنیفہ کے نام کی نسبت سے اپنے نام کے آخر میں نعمانی لکھنے لگے تھے۔ مولانا کی پیدائش ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی، آپ کے والد کا نام حبیب اللہ تھا، آپ نے اپنے دور کے عالموں اور مولویوں سے تعلیم حاصل کی۔ جن میں شکر اللہ، مولوی محمد فاروق چریا کوٹی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے آپ نے عربی ادب معقولات اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی، مولانا کو تعلیم کا اتنا شوق تھا کہ آپ نے تعلیم کے لئے لاہور، رام پور اور لکھنوتک کا سفر کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا۔

جب مولانا شبلی ۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے علی گڑھ گئے تب وہاں ان کی ملاقات سر سید سے ہوئی، اس ملاقات نے شبلی میں بڑی تبدیلی پیدا کی اور مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کی بدحالی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور وہ علی گڑھ تحریک سے بھی متأثر ہوئے علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے اور اس کے بعد سر سید کی صحبتوں سے بھی فیض حاصل کیا مولانا کا انتقال ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں ہوا۔

شبلی نعمانی نے اردو نثر کے فروغ میں انتہائی اہم کردار ادا کیا، ان کے قلم سے بہت سی تصانیف وجود میں آئیں جو قدیم دور کے بادشاہوں، خلفاء اور بزرگان دین کی حیات و خدمات پر مشتمل ہیں۔ان کی اہم ترین تصانیف میں سیرۃ النبی، المامون، الفاروق الغزالی اور شعرالعجم وغیرہ ہیں

المامون شبلی کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی اس میں عباسی خلیفہ مامون رشید کی زندگی کے حالات و واقعات کا بیان ہے۔الفاروق ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی یہ عمر فاروق کی سوانح حیات ہے اس میں بھی شبلی نے تاریخی واقعات کو اپنے طریقے سے پیش کیا ہے یہ دونوں تصانیف دو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔شعرالعجم پانچ جلدوں پر مشتمل ہے یہ شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد ۱۹۱۸ء میں شایع ہوئی، اس میں فارسی شاعروں کے تذکرے کے پہلو بہ پہلو شعر کی ہیئت اور اس کی نوعیت تخئیل اور جذبات نگاری وغیرہ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

سیرۃ النبی ان کی آخری اور اہم ترین تصنیف ہے، اسے انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا یہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں اور آخری جلد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی اس تصنیف میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سوانحی حالات و واقعات بیان کئے ہیں لیکن وہ اپنے اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے ان کے انتقال کے بعد ان کے اس نامکمل پروجیکٹ کو ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ان کے علاوہ رسائل شبلی، علم الکلام، سوانح مولانا روم، الغزالی اور موازنۂ انیس و دبیر وغیرہ تصانیف بھی ان کی یادگار ہیں۔

ناقدین کے خیالات پیش کرنے سے قبل موازنہ انیس و دبیر پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔۱۹۰۷ء میں مولانا شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر کے ذریعہ انیس و دبیر کے مراثی کے محاسن کا تقابلی مطالعہ پیش کر کے اردو میں تقابلی تنقید کی داغ بیل ڈالی ہے۔موازنہ میں بلاغت کے جزئیات کے ضمن میں چودہ مثالیں پیش کی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انیس کا کلام دبیر کے کلام سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔انیس کے کلام میں فصاحت ہے بلاغت ہے چستی ہے شگفتگی ہے اور ہر بات موقع کی مناسبت سے کہی گئی ہے۔انیس کو عظیم مرثیہ نگار ثابت کرنے میں شبلی کامیاب رہے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا کیوں کہ دبیر کا وہی کلام انہوں نے پیش کیا جو کمزور تھا جس میں صنائع و بدائع کی کوئی کمزوری تھی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انیس کا مرتبہ زیادہ بلند ہے۔شبلی نے انیس کے کلام سے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ علم معنی و بیان کے اعتبار سے شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً انہوں نے انیس کا یہ شعر درج کیا ہے:

گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں   اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

شدت کی گرمی پڑ رہی تھی اس کا واقعی بیان ایسا ہے کہ انسان اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہتا: ع بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

مولانا شبلی نعمانی نے موازنۂ انیس و دبیر میں فصاحت و بلاغت کی تاریخ بھی بیان کی ہے جو بہت کارآمد ہے اور تقریباً سبھی اصناف ادب مثلاً غزل،نظم،قصیدہ،مثنوی وغیرہ کے مطالعے میں کام آتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ ہر لفظ ایک طرح کی آواز ہے اور جس طرح کچھ آوازیں شیریں،نرم،ملائم ہوتی ہیں اسی طرح کچھ آوازیں بری، ناگوار اور نامانوس ہوتی ہیں اور اس کی مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ بلبل اور طوطی کی آوازیں کانوں کو اچھی لگتی ہیں جب کہ گدھے اور کوئے کی آواز کانوں کو بری لگتی ہے۔وہ لفظ جو ہندی سے آئے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں جیسے کہ ٹ، ڈ، ڑ، جن میں یہ حرف آجائیں وہ لفظ غیر فصیح ہو جاتے ہیں، جیسے کھاٹ غیر فصیح لفظ ہے اور پلنگ فصیح ہے اسی طرح ناڑا غیر فصیح ہے جب کہ کمر بند فصیح ہے۔دبیر کے کلام میں ناڑا لفظ آیا ہے جسے شبلی غیر فصیح بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انیس کے کلام میں ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں آیا۔

مولانا نے بلاغت کے بارے میں جو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی بیان موقع کی مناسبت کے خلاف نہ ہو، جیسا موقع ہو ، جیسے حالات ہوں ویسا ہی بیان بلاغت ہے۔خوشی کے موقع پر خوشی کے الفاظ اور رنج وغم کے موقع پر رنج وغم پیدا کرنے والے الفاظ آئیں۔

موازنۂ انیس و دبیر پر ناقدین کے نظریات

تنقید کے لغوی معنی پرکھنا ہوتا ہے۔ادب میں تنقید کے معنی کسی فن پارے کے محاسن اور معائب کا صحیح اندازہ کرنا اس پر ایمان داری سے رائے قائم کرنا تنقید ہے۔تنقید کی روشنی میں جب ہم موازنۂ انیس و دبیر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں انیس کی شاعری کے بنیادی محاسن کا پتہ چلتا ہے۔شبلی نے انیس کے محاسن کلام کو بتانے کے لئے مرزا دبیر کو شامل رکھا۔زیادہ تر ناقدین نے موازنہ کو انیس کی بہتری سے تعبیر کیا ہے۔

مہدی افادی نے موازنۂ انیس و دبیر کو اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ قرار دیا ہے اور موازنہ کو ادبی تنقید کی حیثیت سے ایک نصابی چیز سمجھتے ہیں۔

'یہ بھی صحیح نہیں کہ شبلی کو موازنۂ انیس و دبیر میں کامیابی نہیں ہوئی 'سرخ خواں طبقہ' جو چاہے کہے لیکن موازنہ میں جو تعلیم یافتہ فرقہ شبلی کا مخاطب صحیح ہے وہ اس کتاب کو مؤلف کے کمالات میں اختراع فائقہ (یعنی ماسٹر پیس) نہ سہی تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو ادب میں وہ ایک قیمتی اضافہ سمجھتا ہے اور موازنہ بھی تنقید ادبی کی حیثیت سے ایک نصابی (اسٹینڈرڈ) چیز ہے اور وہ میرے آپ کے اعراف کا محتاج نہیں' (۲)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب اردو تنقید کا ارتقا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ شبلی نے ناقدانہ زاویہ نظر پر روشنی ڈالی ہے اور وہ مہدی افادی کی طرح موازنۂ انیس و دبیر کو صرف نصابی چیز نہیں سمجھتے،ان کا خیال یہ ہے کہ انیس و دبیر کی شاعری کا محض مقابلہ نہیں

بلکہ موازنہ سے شاعری کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے

'اس کتاب میں انہوں نے اردو کے مشہور مرثیہ گو شاعر میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کا آپس میں مقابلہ کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے کام لیا ہے اور انہی کی روشنی میں ان دونوں کی شاعری پر بحث کی ہے۔فصاحت و بلاغت اور معنی و بیان کی اصطلاحات کے متعلق موازنہ انیس و دبیر میں اچھی بحث ملتی ہے۔موازنہ کے متعلق مہدی افادی کا خیال ہے کہ یہ بھی ادبی تنقید کی حیثیت سے ایک نصابی (اسٹینڈرڈ) چیز ہے۔اس کی تنقید کا انداز بالکل مشرقی ہے،لیکن اس سے شاعری کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اور انیس و دبیر کے کلام کی خصوصیات ذہن نشین ہو جاتی ہیں'(۳)

پروفیسر آل احمد سرور کو بھی مہدی افادی کی رائے سے اختلاف ہے وہ بھی موازنہ کو نصابی چیز نہیں مانتے ان کا نظریہ ہے کہ انیس کے مطالعے کے لئے اس کی وہی اہمیت ہے جو غالبؔ کے لئے یادگار غالب کی ہے

'موازنہ کو مہدی نے نصابی چیز کہا ہے یہ غلط ہے اس میں مرثیہ کی تاریخ ناقص اور سرسری ہے اور دبیر پر تنقید سطحی ہے لیکن اس کا نقطۂ نظر صحیح،اس کی تنقید اہم اور اس کا فیصلہ قطعی ہے۔انیس کے مطالعہ کے لئے اس کی وہی اہمیت ہے'

ڈاکٹر شارب ردولوی کا خیال ہے کہ موازنۂ انیس و بیر اردو تنقید میں تقابلی تنقید ہے۔وہ لکھتے ہیں:

'اردو میں تقابلی تنیقد کی کئی مثالیں ملتی ہیں جن میں موازنہ انیس و دبیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اس موازنہ کے جواب میں بہت سے مضامین لکھے گئے لیکن وہ اس اہمیت کو نہ پہنچ سکے۔موازنۂ انیس و دبیر کی خصوصیت یہ ہے کہ شبلی نے پہلے مرثیہ گوئی کی تعریف کی ہے اس کے بعد انیس کے کلام کی خصوصیت ،فصاحت،روز مرہ محاورہ ،مضامین کی نوعیت ،ردیف و قافیہ کی موزونی، بلاغت اور اس کے جزئیات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔پھر اس کے بعد انیس و دبیر کے کلام سے مثالیں دے کر اس کی فضیلت و بڑائی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے'

موازنہ انیس و دبیر اپنے انداز نقد کی وجہ سے تنقید میں اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ اس میں عام طور پر شعری محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے،اور انیس کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے فصاحت میں بھی ایک سائنٹفل انداز اختیار کیا گیا ہے۔موازنہ کو جمالیاتی تنقید کی بہترین مثال کہا جاسکتا ہے(۵)

پروفیسر احتشام حسین بھی موازنہ انیس و دبیر کو اردو تنقید میں تقابلی تنقید کی حیثیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'اس میں تقابلی تنقید کے لوازم کو سامنے رکھ کر بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ چند مثالوں کی مدد سے انیس کو دبیر پر فوقیت دے دی گئی ہے شاید اکثر تنقید نگار اس نتیجے پر پہنچتے لیکن موازنہ میں یہ بحث غیر اطمینان بخش ہی نظر آتی ہے۔تاہم یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اردو تنقید کی تاریخ میں اس پیمانے پر تقابلی تنقید کی یہ پہلی کوشش ہے'(٦)

تاریخ ادب اردو میں رام بابو سکسینہ نے موازنہ پر رائے دی ہے

'موازنہ انیس ودبیر۔۔۔۔ایک بیش بہا تصنیف ہے اوراس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اس کے جواب میں نکلیں مگر پھر بھی اس کی اکثر باتیں کارآمد اور صحیح ہیں(۷)

پروفیسر کلیم الدین احمد جوار دو تنقید کو معشوق کی موہوم کمر سے تعبیر کرتے ہیں۔موازنہ انیس ودبیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

'شبلی نے ایک مخصوص صنف مرثیہ اور ایک مخصوص شاعر انیس کے کلام پر تفصیلی ریویو بھی کیا اور میر انیس کے کلام کا مرزا دبیر کے کلام سے موازنہ بھی کیا۔شبلی کا زاویہ نظر شبلی کی تنقید کا ساز وسامان اور شبلی کا اسلوب ان سب چیزوں پر پرانی تنقید کی صاف کارفرمائی ہے۔شبلی مشرقی حدود کے اندر بھی زبردست لغزشیں کرجاتے ہیں۔وجہ ہی ہے کہ وہ باتیں صحیح سمجھتے ہیں لیکن ان باتوں کے منطقی نتائج سے آگاہ نہیں ہوتے ،شبلی کو مرثیوں کے امکانات وحدود سے صحیح واقفیت نہیں۔چبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں(۸)

ان ناقدین کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ موازنہ انیس ودبیر کو بہت شہرت ملی اوراس کے جواب میں کئی کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن شبلی نے موازنہ انیس ودبیر کے اسلوب میں علمی انداز میں جو دلکشی پیدا کی ہے اس کا نعم البدل کوئی نہیں پیدا کرسکا

(۱)تنقیدیں	پروفیسرخورشیدالاسلام	ص ۳
(۲)	مہدی افاسی	ص ۱۷۳،۱۷۴
(۳)اردوتنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	ص ۳۷۱
(۴)آل احمد سرور	موازنہ انیس ودبیر مشمولہ تنقید کیا ہے	ص ۸۸
(۵)ڈاکٹر شارب ردولوی	جدید اردو تنقید اصول ونظریات	ص
(۶)پروفیسر احتشام حسین	عکس اور آئینے	ص ۱۴۹
(۷)رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو حصہ نثر	ص ۷۳

☆☆☆☆☆

حالی کی تنقید نگاری

ڈاکٹر قمر نازنین
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
راجستھان یونیورسٹی۔ جے پور

اردو ادب کی تاریخ میں مولانا الطاف حسین حالؔی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ حالؔی نہ صرف ایک شاعر اور نثر نگار تھے بلکہ اردو کے پہلے با قاعدہ نقاد (Critic) بھی شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو نئی سمت، نیا شعور اور اصلاحی فکر دی۔ حالی کی تنقید میں جدت، سادگی اخلاقی پیغام اور حقیقت پسندی نمایاں نظر آتی ہے

ڈرائیڈن انگریزی زبان و ادب کے نقاد ہیں ان کے بارے میں جمیل جالبی اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں کہ

ڈرائیڈن سے پہلے کلاسیکی رجحان کے زیر اثر انگریزی ڈرامے کو ادب کے درجے سے گری ہوئی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ڈرائیڈن نے بتایا کہ یہ بھی اپنی جگہ ایک نئی صنف ہے اور اس میں بھی تخلیقی قوتوں کا کمال موجود ہے(۱)

حالؔی بھی ان حقیقی نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی فطرت ہر ادبی خوبی کو قبول کر کے اس کی اہمیت کو واضح کرنا ہے حالؔی ڈرائیڈن کی طرح ہی فطری طور پر نقاد تھے۔ حالی کی تنقید میں ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بے جا تعریف کر رہے ہیں لیکن وہ عام لکھنے والوں کا دل بھی بڑھاتے ہیں وہ کانٹوں میں سے پھول چننے کا ہنر جانتے تھے جو چیزیں اعتراض کے قابل ہوا کرتی تھیں ان میں سے قبول کئے جانے والی چیزوں کو تلاش کر کے سامنے لاتے تھے ان کا ماننا تھا کہ کسی بھی ادب پارے کی خوبیاں تلاش کر کے ان کی تعریف بھی کی جانی چاہئے۔

حالی کی شاعری ہو یا نثری تصانیف سب تنقید کے دائرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی

ان کا ادب صحیح معنی میں 'تنقید حیات' ہے۔

ان کے یہاں ان کا نظریۂ حیات پہلی چیز ہے اور تجربہ بعد کی چیز ہے اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مقدمۂ شعر و شاعری ان کا شاہ کار ہے اس پر کافی اعتراضات ہوئے اور ہوتے بھی رہیں گے لیکن تنقید کو نکتہ چینی سے نکال کر ادب میں شامل کیا اور با قاعدہ اردو میں

تنقید کا آغاز کیا۔ دراصل حآلی کے تنقیدی خیالات ان کی شاعری کے علاوہ دیگر تصانیف حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید کے ذریعے بھی معلوم ہوتے ہیں مقدمۂ شعر وشاعری حآلی کی سب سے اہم تنقیدی تصنیف ہے جس میں مکمل طور پر ان کے تنقیدی نظریات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اس میں بیشتر خیالات حآلی کے اپنے ہیں۔ان کے ان خیالات کی وجہ سے اردو ادب خاص طور پر اردو شاعری کا رنگ ڈھنگ اور مزاج بدل گیا۔حالی نے روایتی شاعری اور موضوعات کو اپنی کتاب میں تنقید کا نشانہ بنایا۔حالی کا ماننا تھا کہ تین چیزوں کے بغیر شاعری میں کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا۔تخئیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ، حآلی کہتے ہیں کہ یہی خوبیاں شاعری اور غیر شاعری میں فرق واضح کرتی ہیں

حآلی کا ماننا تھا کہ شاعر کے اندر قوت تخئیل جس قدر زیادہ ہوگی اس کی شاعری اتنی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور اس کی قوت تخئیل جتنی ادنیٰ درجہ کی ہوگی شاعری بھی اتنی ہی ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔قوت تخئیل کی بنیاد پر شاعر جنت وجہنم اور رزم و بزم کا بیان اس طرح کرتا ہے گریا اس نے تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔اردو میں حالی نے پہلی بار ان خیالات سے بحث کی اور اسے تنقیدی انداز میں پیش کیا۔

مطالعہ کائنات حالی نے شاعر کے لئے ضروری قرار دیا ہے ان کا ماننا ہے کہ جب قوت تخئیل ہونے کے بعد بھی شاعر کی معلومات کا دائرہ تنگ اور محدود ہو تب فطرت کا مطالعہ شاعر کی بہت مدد کرتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ شاعری کا سارا مواد کائنات میں ہی موجود ہے اور کائنات کے مطالعے سے جو مواد حاصل ہو اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنانا چاہیئے۔

تفحص الفاظ حآلی کے نزدیک تیسری شرط ہے اس کے ذریعے شاعر اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرتا ہے حالی کہتے ہیں کہ شاعر کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہونی چاہیئے۔شاعری کو دلکش بنانے کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ کا استعمال ہونا چاہیئے جس طرح ایک مصور اپنی پینٹنگ کو خوبصورت بنانے کے لئے مناسب ترین رنگوں کا استعمال کرتا ہے اسی طرح شاعر کو سوچ سمجھ کر، چھان پھٹک کر لفظوں کا استعمال کرنا چاہیئے، حآلی الفاظ کی کانٹ چھانٹ اور خیالات کے ردوبدل کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مقدمۂ شعر وشاعری پر انہوں نے دس برس کام کیا، انہوں نے اردو تنقید ایک ادبی عمل بنا دیا اور ہم سخن کے بجائے ادب کا لفظ استعمال کرنے لگے (سخن حالی سے پہلے کا ادب تھا) بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

> 'ہم اب سخن کے بجائے ادب کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور وہ نظریہ جو ادب کو سخن سے مختلف کرتا ہے مقدمہ ہی کی پیداوار ہے اور اسے ایک طرح سے معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔حآلی کے اس معجزہ نے ہماری نظر بدل دی، ہمارا مذاق بدل دیا اور ادب پر تنقید کرنا سکھایا اور ادب کو محض صنایع بدایع کی تعریف، محاورات اور زبان کی غلطیوں سے نکال کر ادب کے معنی ادب کے مقصد اور مختلف اصناف ادب کی اہمیت پر غور کرنے کا راستہ دکھایا'

تنقیدی نظریات میں آج بھی حالی کی پیروی کی جاتی ہے اصول تنقید کی عمارت ان کی بنائی ہوئی بنیادوں پر کھڑی ہوگی اور ان کی مرہون منت رہے گی۔ حاؔلی نے مشرق ومغرب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور آج بھی یہ کام جاری ہے لیکن حالی جتنی کامیابی کسی کو حاصل نہ ہوسکی۔

حوالے:۔ (۱) تاریخ ادب اردو جلد چہارم حصہ اول ص ۹۶۸

☆☆☆

علامہ اقبال اور قران کریم

ڈاکٹر سید عادل احمد
محکمہ آثار قدیمہ، حکومت تلنگانہ
حیدر آباد

علامہ اقبال ۲۹ ڈسمبر ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباو اجداد کشمیر سے آ کر سیالکوٹ میں آباد ہو گئے تھے۔ اِن کے والد شیخ نور محمد بڑے پرہیزگار، نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ اِن کا سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا کاروبار تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے رب کی حمد و ثناء میں مصروف رہتے تھے۔

شیخ نور محمد کو دو لڑکے تھے ایک عطاء محمد اور دوسرے اقبال محمد۔ انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں کو نہایت ہی اعلیٰ تعلیم دی۔ دینوی تعلیم کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی شامل تھی۔ عطاء محمد بڑے ہو کر انجینئر بن گئے مگر ان کے چھوٹے بھائی اقبال نے پرائمری، مڈل اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات میں کامیابی کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ حاصل کیا۔ یہاں سے اِن کی طبیعت میں شاعری سمانے لگی۔ انہوں نے مولانا روم کی شاعری کو کافی پسند کیا اور شروع شروع میں اپنے کلام کو حضرت داغؔ کو بغرض اصلاح ڈاک کے ذریعہ بھیجا کرتے تھے۔

علامہ اقبال ۲۳ سال کی عمر میں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے اشعار کہنے لگے تھے۔ اِن کا کلام زیادہ تر قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کے احکامات اور اِس کے اصولوں کی پابندی میں مضمر تھا۔

اقبال نے کہا میرا کلام بے شک نظمیں اور غزلوں میں بھی لکھا گیا ہے لیکن یہ تمام خیالات قرآن کریم و احادیث سے ماخوذ ہیں جس کے مطالعہ سے روحانی سکون ملتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے لکھا ہے:

صد جہان تازہ در آیات اوست
عصر ہا پیچیدہ در صفحات اوست
بندہ مومن ز آیات خدااست

هــــر جهــــان انــدر بـــرا او چــو قبــا اســت

چــــون کیــــن گـــردر جهـــانــــے در بــــرش

مـــــی دهـــد قـــرآن جهــــانــــے دیــگـــرش

علامہ اقبال کے اِن اشعار کی تعریف میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے کہ قرآن کی آیتوں میں سینکڑوں نئے جہاں پوشیدہ ہیں۔اس کتاب کے صفحات بیتے ہوئے زمانے لئے ہوئے ہیں۔بندہ مومن تو خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔اس لیے وہ ہر دور کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتا ہے۔

اور ایسا ہونا ناگزیر ہے ورنہ بندہ مومن پیچھے رہ جائے گا اور زمانہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا اور زمانہ اسے ایک نیا جہان عطا کرتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن خود مسلمانوں کو وہ طاقت عطا کرتا ہے جس کی بدولت وہ تعمیر نو کا کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔اس کی وجہ سے قرآن بذات خود اپنے پیروؤں میں انقلاب تازہ برپا کرتا رہتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن نے خود اپنے اندر ابدیت وانقلاب دونوں کو ایک جگہ جمع کرلیا ہے۔

اسی تناظر میں ڈاکٹر اقبال نے لکھا ہے:۔

لایـــــزال و دار دانــــــــش نـــو بــــــه نـــو

بـــرگـــی و بـــار مـــحـــکـمـــاتـــش نـو بـــه نـو

بـــــاطـــــن او از تـــغیـــر بـــے غـــمـــے

ظـــــاهـــــر او انـــقـــلاب هـــــر دمـــے

یعنی قرآن کے اصول تو لایزال، ازلی، مستقل بالذات اور دوامی ہیں۔لیکن اس کی تعلیمات ہر دور میں نو بہ نو، تازہ بہ تازہ ہیں۔قرآنی محکمات (قرآن مجید کی وہ آیات جن کے معنی صاف اور واضح ہیں) یعنی قرآنی اصولوں کے پتے اور پھول ہمیشہ تازہ بہ تازہ ہوتے ہیں۔قرآن کا باطن اور اس کی بنیادی تعلیم تو تغیر وتبدل سے پاک ہے۔اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی لیکن اس کا ظاہر یعنی اس کے سیاسی معاشی متمدنی اور اقتصادی احکام ایسی لچک رکھتے ہیں کہ اِن مین ہمیشہ ہمیشہ تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے

دنیا کے اس اعظیم مدبر ومفکر نے دنیا کے مسلمانوں کہ یہ نصیحت کی کہ تم قرانی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ لائے انقلاب کے ذریعہ عصر حاضر میں بھی ایک حقیقی انقلاب برپا کرسکتے ہو۔اگر تم نے قرانی تعلیمات سے دوری اختیار کی تو تم پر ذلت، پستی اور بدحالی کا زوال آجاتا ہے۔اس کی تفصیل انہوں نے اپنی نظم جواب شکوہ میں بڑے خوب انداز میں بیان کی ہے۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اس شعر میں علامہ نے بڑے صاف انداز میں کہہ دیا ہے کہ مذہب اسلامی کے اصول اور قرانی تعلیمات ہی مسلمانوں کے عروج کا اصل حاصل ہیں۔اگر تم اس سے غفلت اختیار کرو گے تو تم اس دنیا میں ذلیل ورسواء ہو جاؤ گے۔اسی نظم میں ایک جگہ علامہ فرماتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

ملت اسلامیہ کے عظم ہمدرد نے اپنی بصیرت افروز نگاہ سے مسلمانوں کو یہ پیغام اپنے شاعرانہ انداز میں بتلایا اور توحید کا یہ پیغام کہ قرآن اور رسول ﷺ کو مشعل راہ بناتے ہوئے عہد رفتہ اور عظمت رفتہ کی یادیں تازہ کریں۔

کون ہے تارکِ آئین رسول مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

علامہ اقبال نے بڑی صاف گوئی سے امت سے سوال کیا ہے کہ تمہاری قرآن کریم سے اور دین سے دوری اور موجودہ ماحول سے تمہاری ہم آہنگی ہی تمہاری بربادی کا اصل سبب ہے۔

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

علامہ مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سارے دل اسلام کی محبت سے خالی ہیں اور تمہیں اپنے رسول اللہ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں شرم آتی ہے۔اس لیے تم نے حکم خداوندی سے دوری اختیار کرلی ہے جس کے سبب تم پر دنیا میں آپسی اختلافات نمایاں ہیں۔اسی نظم میں آگے علامہ لکھتے ہیں:۔

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو یہ انداز مسلمانی ہے

حیدری فرقے نے دولت عثمانی ہے
ہم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

علامہ نے صحابہؓ کے انقلاب اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یاد لاتے ہوے مسلمانوں سے سوال کیا کہ تم میں اپنے اسلاف کی محبت نہیں ہے۔وہ بھی مسلمان تھے مگر قرآن اور رسول کے لائے ہوئے حکم پر چلنے والے اور تم اُس کے ترک کرنے والے اس لیے تم خوار ہو اور وہ معزز تھے اس زمانے میں۔علامہ، اپنی شاعری میں جگہ جگہ قرآن اور رسول کی اطاعت کی دعوت دیتے ہوئے مسلمانوں کو یہ نوید سناتے ہیں کہ۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ نے منجانب خدا عطا کئے گئے تین اصولوں کہ یاد دلایا۔صداقت ،شجاعت اور عدالت جو مسلمانوں کے خصوصی اوصاف ہیں۔اِن کو پھر سے اپنانے کی تاکید کی کہ تم سے ہی دنیا کی دیگر اقوام کی خدمت کا کام لیا جائے گا۔

پابندیٔ تقدیر کہ پابندی احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خرد مند
ایک آن میں سوبار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقالہ ابھی ناخوش ابھی خور سند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

قرآن کریم میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ تمام بنی نوع انسان حضرت آدم علیہ اسلام کی اولاد ہیں۔ایک نفس واحد کے شجر کی مختلف شاخیں ہیں مگر جغرافیائی، نسلی، لسان، علاقائی اور قبائلی گروہ میں بٹ کر ایک دوسرے سے جدا ہوگئی ہیں۔احکام الٰہی مگر سب کے لیے ہیں خاص کر مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تعلیمات قرآنی پر عمل کریں اور دوسری اقوام تک اس دین حق کو پہنچائیں۔

دنیا میں وجود میں آنے والی ہر شئے اور چیز چاہے وہ انسان ہو یا جانور، دیدہ اور نادیدہ مخلوق سب اس خدائے واحد لاشریک کے احکام کے پابند ہیں۔ وہ ان پر اتارے گئے ضابطہ حیات پر عمل کر کے ہی اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور وہ دنیا میں امن وسلامتی، اخوت ومحبت، عدل وانصاف، اتفاق واتحاد اور یکجہتی قائم کر سکتے ہیں۔

علامہ اقبال قرآن کریم سے حد درجہ محبت رکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تحفہ میں بھی قرآن مجید دیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ یہی اہل حق کی دولت وثروت ہے۔ یہ ہر ابتداء کی انتہاء اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیر وشکر بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز وگداز سب اس قرآن کا فیضان ہے۔ اس کو انہوں نے ایسے اشعار میں پرویا ہے۔

اے باد صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی
یہ موج پریشاں خاطر کو پیغام لب ساحل نے دیا
ہے دور وصال بحر ابھی تو دریا میں گھبرا بھی گئی
عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجاب محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلا بھی گئی
کی ترک تگ و دو قطرے نے تو ابروئے گوہر بھی ہے ملی
آوارگی فطرت بھی گئی اور کشمکش دریا بھی گئی
نکلی تو لب اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی یہ صدا ہے
پیغام سکون پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی

۱۸/اگست ۱۹۳۱ کو علامہ اقبال گول میز کانفرس کے لیے لندن روانہ ہوتے وقت دہلی ریلوے اسٹیشن پر جم غفیر سے فرمایا تھا کہ میرے ساتھ کوئی پرائیوٹ سکریٹری نہیں ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ۔ میرے ساتھ صرف حق وصداقت کی ایک جامع کتاب قرآن مجید ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کروں گا۔

۱۹۸۳ میں جب طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو اِن سے روزانہ کی قرآن مجید کی تلاوت چھوٹ گئی جس کا اِن کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا تھا تو انہوں نے اس کا ذکر بڑی حسرت سے کیا ہے۔

ہر نفس سوز جگر باقی نماند

لطف قرآن سحر باقی نماند
نالہ کو می نہ گنجد در ضمیر
تا کجا در سینہ ام ماند اسیر
یک فضاے بے کراں می بایدش
وسعت نا آسماں می بایدش

جب ناسازی حد سے بڑھ گئی تو بڑے بھائی عطا محمد نے بگڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر تسلی دی، تو علامہ کہنے لگے، بھائی میں مسلمان ہوں، موت سے نہیں ڈرتا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔

سحرھا در گریبان شب اوست
دو گیتی را فروغ از کوکب اوست
نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آمد تبسم بر لب او ست

آخر کار مفکر و مبلغ اسلام اور ہمدرد ملت ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ کو بہ عمر ۶۵ سال انتقال ہوا۔

☆☆☆☆

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multiligual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magezine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-7, Issue:-7 to 12 July to December 2020

Price: Monthly:-100rs., Annual:- 1000rs.

Supervision: **Syed Adil Ahmad**, Depart. of Archaeology,State Museum, Hyderabad Telangana

Honorary Editors

Prof. Sahebzada Saulat Ali Khan, Principle, Govt. Girls PG College, Piplu, Tonk (Rajasthan)

Prof. E A Haidari, Retired Principle, Govt. Girls College, Nagar Fort, Tonk (Rajasthan)

Editor: **Syed Iliyas Ahmad Madni,**

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad,

Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580/ 09667489768 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Review Committee	Editorial Board
Prof. M. A. Alvi, Aligarh	**Prof. S. M. A. A. Khurshid**, Aligarh
Prof. U. K. Uddin Kakorvi, Lucknow	**Prof. S. Naukhez Azmi**, Hyderabad
Prof. Aziz Bano, Hyderabad	**Dr. Mohd. Aqeel**, Varanasi
P. Anuaradha Reddy, Hyderabad	**Dr. Md. Ehteshamuddin**, Aligarh
Dr. Syedah Asmath Jahan, Hyderabad	**Muttabi Ali Khan**, Hyderabad
Dr. M. A. Naeem, Hyderabad	**Dr. Mohd. Qamar Alam**, Aligarh
M. A. Ghaffar, Hyderabad	**Sheikh Abdul Raheem**, Hyderabad
Kishore, Jhun Jhunwala, Mumbai	**Dr. Mohd. Tauseef**, Aligarh
Amarbeer Singh, Hyderabad	**Dr. Ahmad Naved Yasir**, Aligarh